سلسلۂ علم

سید محمد امیر امام حرؔ

سلسلۂ غم

سیّد محمدؐ امیر امام حرؔ

سلسلۂ غم

تخمیسِ سلام

غالبؔ و دبیرؔ و انیسؔ
و آثرؔ و محبؔ و محبوبؔ و محبؔ

از

سیّد محمّد امیر امام حرؔ

بمناسبت

صد سالہ یادگار

غالب و انیس و دبیر

تاریخ ہائے وفات

میرزا اسد اللہ خاں غالب

فخرِ عرفی و جانِ طالب مرد   اسد اللہ خاں غالب مرد

۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۶۹ء الطاف حسین حالی

مرزا سلامت علی دبیر

سدرہ بے جبریل، کوہِ طورِ منبر بے دبیر

۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۲ء سرفراز حسین خبیر

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۱ء مرزا سلامت علی دبیر

سلسلۂ مطبوعات

محبّ ویلفیئر سوسائٹی

۲- فریم روز روڈ (نزد کلفٹن برج)

کراچی

مطبوعہ

ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

مطابق اپریل ۱۹۷۱ء

قیمت

تین ۳ روپیے

تعارف

سید عسکری حسین

غالبؔ، انیسؔ اور دبیرؔ کا جو احسان اُردو پر ہے اُس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اُردو شاعری تنوع سے ناآشنا رہتی اور اگر انیسؔ و دبیرؔ نہ ہوتے تو ہماری زبان رزمیہ شاعری کے اعتبار سے تہی دست اور اخلاقی اور نفسیاتی نکات و معانی سے کم مایہ رہ جاتی۔ نہ مرثیہ ایک مسلّم صنفِ سخن ہوتا اور نہ رُباعی۔

گذشتہ سال غالب کی صد سالہ یادگار منائی گئی۔ اس سال انیسؔ کی صد سالہ یادگار منائی جارہی ہے اور آئندہ سال دبیرؔ کی صد سالہ یادگار منائی جائے گی۔ چنانچہ محبّ ویلفیئر سوسائٹی نے، جس کا ایک اہم مقصد ہماری زبان اور ثقافت کی ترویج بھی ہے، یہ طے کیا کہ اس سال کوئی ایسی کتاب شائع کی جائے جو اُردو کے ان تین عظیم شاعروں کی صد سالہ یادگار سے مناسبت رکھتی ہو۔ پھر اسی سال مہاراجہ صاحب محمود آباد کی چالیسویں برسی منائی جارہی ہے، اس لئے محبُ ویلفیئر سوسائٹی کے تمام ارکان کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کتاب میں اُن کے محسن کا بھی تذکرہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام خاصا وقت طلب تھا۔ مگر جناب سید محمد امیر امام صاحب حُرؔ نے یہ مشکل آسان کردی۔

جناب حُرؔ کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم انگلستان میں۔

۱۹۵۲ء میں آپ نے کیمبرج سے ٹرائی پاس کیا۔

فلسفہ، نفسیات، تاریخ اسلام اور ادب آپ کے پسندیدہ مضامین ہیں۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں آپ کو یکساں دستگاہ حاصل ہے۔ شاعری آپ کو ورثہ میں ملی ہے، دادھیال سے بھی اور ننھیال سے بھی۔ آپ کے پردادا جناب نواب امداد امام صاحب اثر نہ صرف ایک بلند پایہ محقق اور ناقد تھے بلکہ اردو فارسی اور عربی کے ممتاز شاعر بھی۔ آپ کے پرنانا امیر الدولہ بہادر، نانا مہاراجہ صاحب محمود آباد اور خال محترم جناب راجہ صاحب محمود آباد کا شمار بہترین مرثیہ گویوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں کہ جناب حرؔ اس عہد کے صفِ اوّل کے مرثیہ گویوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

"سلسلۂ غم" میں جناب حرؔ کی دس تضمینیں، آپ کے ایک طویل مسدّس "سلسلۂ فکر و عمل: صواعق و شہب" کے ۳۱ بند اور "غالب اور اُن کا عہد" کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔

غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ، اثرؔ، محبؔ، محبوبؔ اور حبّؔ کے سلاموں پر جناب حرؔ کی تضمینیں خیال آفرینی کے اعتبار سے بڑی برجستہ ہیں۔ بعض بند پڑھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے یہ حضرات ہمارے ہی دور کے نمائندہ ہیں، انھیں بھی اُنہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن سے آج ہم دوچار ہیں اور ان کے سوچنے کا انداز بھی وہی تھا جس طرح آج ہم سوچتے ہیں۔ تضمین کا کمال محض بندشوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی نہیں بلکہ تخیل کا وہ تسلسل ہے جو ماضی کو حال سے ملاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے جناب حرؔ اس عہد کے تضمین نگاروں میں منفرد نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، جناب حرؔ کو تاریخ اسلام سے بڑی گہری دلچسپی ہے اور آپ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کی صحت کو پرکھنے میں روایت کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ واقعات کربلا کے سلسلہ میں بھی آپ مقاتل کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں اور ہر واقعہ کی صحت متعیّن کرنے کے لئے آپ اُسے اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ مروجّہ روایات اور مسلمہ عقائد سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ آپ کا طویل مسدّس "سلسلۂ فکر و عمل: کرب و بلا"، جس کے تقریباً آٹھ سو بند کہے جا چکے ہیں اور جو دو ہفتگی "ارشاد" میں مسلسل شائع ہو رہا ہے، نہ صرف شاعری کے اعتبار سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے بلکہ واقعاتِ کربلا کی صحت کے اعتبار سے بھی منفرد ہے۔

جناب حرؔ کو غالبؔ سے بڑی محبّت ہے۔ وہ غالبؔ کو نہ صرف ایک بڑا شاعر مانتے ہیں بلکہ ایک مفکر بھی۔ آپ کے نزدیک غالبؔ اردو کا وہ واحد شاعر ہے جو لکیر کا فقیر نہیں، جو محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ سوچتا بھی ہے اور جس کی نظریں محض اپنے عہد کے مسائل تک محدود نہیں۔

"غالب اور اُن کا عہد" کے عنوان سے جو مقالہ جناب حرؔ نے فروری ۱۹۶۹ء میں لندن میں صد سالہ یادگار غالبؔ کی تقریب کے موقع پر سمپوزیم میں پڑھا تھا وہ بھی اس مجموعے میں شامل کیا جا رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اہلِ علم محبؔ ویلفیئر سوسائٹی کی اس کوشش کو ضرور پسند فرمائیں گے۔

تضمین اور تخلیق

از مجتبیٰ حسین

سخن گوئی سے سخن فہمی کچھ مشکل چیز نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات سُخن گوئی کی تحریک اور خود سخن کی بقا سخن فہمی پر منحصر ہوتی ہے۔ تضمین کا فن سخن گری اور سخن فہمی دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے یہ بڑا مشکل فن ہے۔ یہ صرف قافیہ پیمائی اور مصرعوں کی پیوند کاری نہیں ہے۔ اس شاعر کے کلام کو، جس پر تضمین مقصود ہو، سمجھنا، اُس کے لفظی اور معنوی حسُن کو پہچاننا اور اُس کو اپنے عہد کی معنویت سے ربط دے کر ایک نئے پیکر میں ڈھالنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کارگہہ شیشہ گری میں ایک سانس بھی اگر تیز ہُوئی تو آبگینہ شعر ٹوٹ سکتا ہے۔ دوسرے شاعر کے شعر کو اپنانا بڑا نازک مرحلہ ہے۔ ذرا قلم بہکا اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ بالخصوص جب کسی بڑے شاعر کے کلام پر تضمین کے لئے شاعر قلم اٹھاتا ہے تو معاملہ کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ بڑا شاعر گرفت ہی میں نہ آئے۔ اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ اس کی شعری عظمت کے سامنے دوسرے شاعر کی ہمّت چھوٹ جائے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ طنبورے کی آواز کوئی اور آواز پکڑ لے، اور گانے والے کی آواز کسی دوسری طرف کا رُخ کرے۔ بڑے شاعر کی

آواز سے آواز ملانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ہمنوائی بڑی جُرأت، حوصلے اور سلیقے کا مطالبہ کرتی ہے۔ آدمی ذرا بے سُرا ہُوا اور تضمین غارت ہوئی۔ مگر تضمین صرف ہمنوائی نہیں ہے۔ یہ اُس سے آگے کی چیز ہے۔ اس میں دو سُر مل کر ایک تیسرے سُر کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ اشعار کی از سرِ نو تخلیق ہے۔

تخمیس کے اس مختصر سے مجمُوعے میں آپ کو کئی ایسے شاعر ملیں گے، جو اُردو شاعری کی آبرو ہیں۔ غالبؔ، انیسؔ اور دبیرؔ یہ تینوں شاعر اپنی فکر اور اپنے لب و لہجے کے لحاظ سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔ ان کی آواز سے آواز ملانا اور اُن کے اشعار کو اپنے دور سے ہم آہنگ کرنا مشاقی اور فنکاری بھی ہے اور قدیم اور جدید عہد کے تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی ربط سے باخبری بھی ہے۔ ادبی اور تہذیبی ارتقا سے گہری واقفیت کے بغیر ان شعرا پر تضمین یا تخمیس ممکن ہی نہیں ہے۔

امیر امام صاحب حرؔ سخن گو بھی ہیں اور سخن فہم بھی۔ اسی لئے انہوں نے مختلف شعرا کے مختلف رنگوں کو اپنے مخصوص رنگ سے ملا کر قوسِ قزح میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں کسی بھی تخمیس کو آپ پڑھیئے، آپ محسوس کریں گے شاعر کی نظر گزشتہ عہد کے تہذیبی تقاضوں اور تاریخی شعور کے اُن زندہ اور توانا عناصر پر ہے جن کو وہ اپنے عہد کے تہذیبی تقاضوں اور تاریخی شعور سے ربط دے سکتا ہے۔ اس ربط کو سمجھے بغیر ادبی ارتقا کی کڑیاں نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی تخمیس بھی ایسی نہیں ہے۔ جہاں یہ تاریخی ربط آپ کو دُھندلا نظر آئے۔

ان کی اہمیت محض یہ نہیں ہے کہ نہایت صفائی، برجستگی اور شگفتگی کے ساتھ مصرعے لگائے گئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مصرعوں کے ذریعے سے ہم اُس انسانی ذہن کو دریافت کرتے ہیں جو غالبؔ، انیسؔ دبیرؔ، امداد امام اثرؔ، محبؔ، حبؔ اور محبوبؔ کے دور میں فکری ارتقاء کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ اور اب امیر امام صاحب حُرؔ کے دور میں نئے مسائل حیات سے دوچار ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ ایک دریافت ہے۔ تضمین دراصل ایک نوع کی دریافت ہی کا دوسرا نام ہے۔ غالبؔ کے سلام کا یہ شعر دیکھئے ؎

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

اور اس پر امیر امام صاحب حرؔ کے یہ تین مصرعے دیکھئے ؎

سمجھ میں آئے نہ اخلاق و عقل کے آئیں
اُصول فقہ ہیں سختی کے ساتھ ذہن نشیں
نہیں جو عدل تو فتووں میں اعتدال نہیں
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

غالبؔ کے اس شعر کو ان تین مصرعوں نے ایک تاریخی ارتقاء کا رنگ دے دیا۔ یہ شعر موجودہ دور کی سیاسی کش مکش میں پہنچ گیا۔ اور غالب کا فقہی طنز سیاسی طنز میں اس طرح ڈھل گیا ہے کہ فقہ اور استبداد کا ربط واضح ہوگیا۔

اسی طرح میر انیسؔ کے سلام کا یہ مطلع ملاحظہ ہو۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

اب یہ دیکھئے امیر امام صاحب حُرؔ کے تین مصرعوں نے اس "گناہ" کی توضیح اور تعریف کس طرح کی ہے۔

ہم اپنے دل سے فرائض کو یوں بھلا کے چلے
روا روش میں حقوق بشر مٹا کے چلے
نہ جانے کتنے دلوں کو یہاں دُکھا کے چلے
گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

انیسؔ کے یہاں "گنہ کا بوجھ" حصارِ شرع سے باہر نہیں آسکا۔ ان تین مصرعوں نے "فرائض کو بھلانے" "حقوق بشر کو مٹانے" اور "دلوں کو دُکھانے" کی طرف اشارے کرکے اس "بوجھ" کی تعریف مکمل کردی ہے جسے انیسؔ نے گناہ سے تعبیر کیا تھا۔ ان مصرعوں نے ایک وسیع انسانیت کا تصوّر پیدا کردیا ہے۔ یہ انسانی تصور اس معاشرے ہی میں اُبھر سکتا ہے، جہاں طبقات کی ناہمواری ختم ہوجائے۔ یہ ناہمواری کیونکر ختم ہوگی یا ہوسکتی ہے، شاعر اس سے بے خبر نہیں ہے۔ انیس کے ایک دوسرے شعر پر یہ تین مصرعے سُنئے۔

تیغِ حریت سے کٹ جائیں گے استبداد و شر
ہوں گے جنباں انقلابِ دہر سے سب دشت و در
کانپ اُٹھیں گے جلالِ عدل سے سب اہلِ زر
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اُن کے سر

آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

انیسؔ کے خالص اخلاقی شعر میں انقلابی رُوح دوڑنے لگی۔ وہ "کل" جو انیسؔ کے یہاں تھا۔ ایک زندہ اور توانا "آج" بن کر ساری دُنیا کے سرمایہ دار کو للکار رہا ہے۔

اس مجموعے کی یہی بڑی خوبی ہے کہ اُس نے حسینؑ اور حسینیت کو ایک انقلابی پیغام اور نظامِ فکر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ میں بھی سوچتا ہوں، آپ بھی سوچیئے اگر غالبؔ، انیسؔ یا دبیرؔ زندہ کر دیئے جائیں اور انہیں یہ تخمیس سنائی جائے تو اُن کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ یا کیا ہو سکتا ہے۔ تضمین یا تخمیس کے سلسلے میں یہ بڑا اہم سوال ہوگا۔ تضمین کی ساری کامیابی یا ناکامی اسی سوال کے جواب پر ہے۔ یہ شعرا اپنے اشعار کی اس توضیح اور تشریح پر مکدّر ہوں گے یا محظوظ ہوں گے۔ مگر اس سوال کے جواب سے پہلے ان شعرا کو اُن کے عصری پس منظر میں پڑھنا، ان کے دلوں کی اُمنگوں اور اُن کے خوابوں کی تعبیر کو سمجھنا ضرُوری ہے۔ اُس کے بغیر آپ کا جواب تشنہ رہے گا۔

میرے خیال میں امیر امام صاحب حُرؔ کی زبان سے اپنے کلام کی تخمیس سُن کر غالبؔ، انیسؔ یا دبیرؔ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے تخمیس کے ذریعے سے ان شعرا کے کلام کو تقویّت پہنچائی ہے۔



دل کو شعورِ عدل سے غم کا صلہ ملا
ماضی سے لے کے حال تک اک سلسلہ ملا

سید محمد امیر امام حرؔ

سیّد محمد امیر امام حرؔ

غالبؔ اور اُن کا عہد

یہ مقالہ سیّد محمد امیر امام حرؔ نے ۱۴ر فروری ۱۹۶۹ء کو اسلامک کلچرل سینٹر لندن میں صد سالہ یادگار غالبؔ کی مناسبت سے منعقد شدہ نشست میں پڑھا تھا۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ فرد اور اُس کے سماج کے درمیان ایک بہت گہرا ارتباط ہوتا ہے اور ہر فرد اپنے مخصوص سماج اور محیط و ماحول کا آفریدہ ہوتا ہے۔ سماج اور ماحول کا حال اُن کے ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے لہٰذا کسی مخصوص فرد کی کم و بیش صحیح معرفت کے لئے نہ محض اس کے سماج، اس کے مادی ماحول اور اس کے ذہنی و فکری محیط کا جاننا ضروری ہوتا ہے بلکہ اس کے اجتماعی و تاریخی پس منظر ماضی و حال کو بھی پیشِ نظر رکھنا لازم ہوتا ہے۔ ہر فرد نہ محض اپنے عہد کا آفریدہ ہوتا ہے بلکہ خود اُس کا عہد اور وہ خود دونوں عہد ماضی کے آفریدہ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دونوں عہد آئندہ کے آفرینندہ بھی ہوتے ہیں، اور اسی تسلسل عللی میں کسی مخصوص فرد یا شخصیت کی تخلیقی اہمیّت و منزلت مضمر معلوم ہوتی ہے۔

فکر و علم و ادب کی دُنیا میں تخلیقی عمل ہی سے تقدم و ترقی کے امکانات

پیدا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان امکانات کی کمیت و کیفیت تخلیقی عمل کی کمیت و کیفیت سے متناسب ہوتی ہے اور اسی تناسب سے عہد آئندہ کے تقدم و ترقی کے مدارج کا تعین ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی مخصوص عہد اپنی عملی کمیت و کیفیّت کے تناسب سے فکر آفرین یا علم آفرین یا ادب آفرین ہوتا ہے، اسی طرح کوئی مخصوص فکری یا علمی یا ادبی سعی بھی اپنی عملی کمیت و کیفیت کے تناسب سے عہد آفرین ہوتی ہے۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عہد آفرین ادب کے کیا کیا شروط و خواص ہوتے ہیں۔ اس بات سے ایک گذشتہ شائع شدہ مقالے میں زیر عنوان "ادب اور عہد" (مجلہ بزم ادب سراج الدولہ کالج کراچی، سنہ ۱۹۶۷ء سنہ ۱۹۶۸ء) بحث کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اُس کا اعادہ نہ محض تکرار بے جا ہو گی، بلکہ زیر بحث موضوع سے ہمیں دُور کر دے گی۔ یہاں محض اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان شروط و خواص کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کی فکری و ادبی کاوشیں نہ محض آفریدہ عہد ماضی تھیں بلکہ عہد آئندہ کی آفرینندہ بھی تھیں۔

غالبؔ کی شخصیّت کا تاریخی اور سماجی پس منظر ہنگامہ خیز تضادات و تناقضات کا حامل نظر آتا ہے۔ ایسے شدید تناقضات و تضادات جن کے نتیجے میں سریع الوقوع اور چونکا دینے والے تغیّرات کے رونما ہونے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ غالبؔ ایک ایسے عہد اور ایسے سماج میں پیدا ہوئے تھے جس میں اس نوعیت کے تغیرات رونما ہو چکے تھے۔ سیاسی سطح پر سلطنتِ مغلیہ کا زوال و انحطاط تو اُن کی پیدائش سے کم از کم ایک نسل قبل ہی شروع ہو چکا تھا لیکن ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی نہ محض

زوال و انحطاط کے آثار رونما ہو چکے تھے بلکہ انتشار و پراگندگی بھی پھیلتی جا رہی تھی۔

ان ہی بحرانی حالات کے گہوارے اور ہنگامہ خیز زمانے کی آغوش میں ایک نئی زبان کے لباس میں ایک نئے ادب کی پرورش ہو رہی تھی۔ برصغیر میں عالمگیری عہد کے ساتھ ساتھ فارسی کی اہمیّت بھی ختم ہو گئی تھی لیکن انگریزی کی اہمیت برصغیر کے شمال وسطی و شمال مغربی علاقوں میں اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد بڑھنا شروع ہوئی، یعنی بعد از جنگ آزادی جسے اکثر انگریزی مورخین نے غدر سے تعبیر کیا ہے۔ اس وقفہ درمیانی میں اُردو کے رُوپ میں ایک نیا ادب پروان چڑھا۔ اور ایک نئی ثقافت کی بنیاد پڑی جو نہ تو قدیم ہندی ثقافت تھی، نہ عربی، نہ ترکی، نہ ایرانی بلکہ ان سب کی میراث کی حامل تھی۔ اُردو ان تمام السنہ و اقوام کی ثقافتوں سے بہرہ یاب ہو کر اپنی مخصُوص مخلوط شکل و صورت میں ترکیب پا کر رونما ہوئی تھی۔ نہ محض باعتبار الفاظ و کلمات بلکہ افکار و خیالات و تصورات کے لحاظ سے بھی۔ ظاہر ہے کہ اُردو ادب پر سب سے گہرا اثر تو ادب فارسی ہی کا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ مقامی و محلی اصلی ہندی ثقافت کے ادبیات کی بھی گہری چھاپ اس پر ضرور تھی چونکہ دونوں کا جغرافیائی اور مقامی اور سماجی محیط و ماحول تقریباً بالکل یکساں اور مشترک تھا۔ اُردو کو جہاں خسرو کا ثقافتی ترکہ حاصل ہوا تھا وہاں اُسے کبیر داس کے خیالات کی میراث بھی ملی تھی، جہاں اسلامی شعار اس کے حصے میں آیا تھا، وہاں ہندوستان کے قدیم ماورا الطبیعاتی تخیلات و افکار کا شعور بھی اسے تھوڑا بہت نصیب ہوا تھا۔ کبیر داس کے دوہوں کی دل نشین سادگی، خسرو کے تغزل کی رنگینی، فیضی کی آزاد خیالی،

عرفی کا زورِ بیان، نظیری کی بیساختگی، بیدل کا تصوف اور ان سب کے ساتھ ساتھ ادبی آفاقیت کی پہنا آوری، یہ تمام خصوصیات اس نئی زبان یعنی اردو اور اس کی ثقافت کو میراث میں ملی تھی۔

غالب کے ورود سے پہلے یوں تو بہت سی شمعیں اس اردو ثقافت کی گرمیِ محفل بن چکی تھیں اور ان سے اِسے بار بار فروغ حاصل ہوتا رہا تھا، لیکن جو دو نام تصوّر میں سب سے بڑھ کر روشن نظر آتے ہیں، وہ اوّل تو میر اور دوسرے سودا کا نام ہے۔

میر کے احساسات کی گہرائی اور اُن کے انداز بیان کا سوز و درد و گداز اور سودا کی شوخیِ طبع اور انداز بیاں کی تیزی ان سب سے اردو ادب میں ایسی خصوصیات کا اضافہ ہو چکا تھا کہ اُسے فارسی اور ہندی دونوں سے علیحدہ ایک مستقل انفرادی جگہ حاصل ہو چکی تھی۔

اسی دوران میں سیاسی بحران بڑھا۔ تیس سال کی قلیل مدّت میں دلّی کا شہر بار بار لٹا اور تباہ و برباد ہوا۔ نادر شاہ دُرّانی، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے ہاتھوں اُسے کسی کل چین نہ ملا۔ اقتصادی اضطرار اور معاشی خلفشار نے سماج کو تہہ و بالا اور پراگندہ کر دیا۔ امن و امان کی تلاش میں بہت سے اہل ہنر و دانش نے دلّی سے لکھنو کا رُخ کیا اور اس افراتفری میں میر اور غالب کے درمیان کی نسل نے اُردو ادب میں کوئی اس پایہ کا شاہکار پیش نہ کیا جو ان دونوں کے ادبی کارناموں کے ساتھ ہم پایہ و ہم پلّہ تصور کر کے رکھا جا سکے۔

میر اور سودا کو آخری اور دائمی سکون لکھنو کی خاک کے دامن میں ملا۔ جب میر کے آخری دن لکھنؤ میں کٹ رہے تھے اور ادب اُردو کی بزم

کی یہ روشن شمع جھلملا رہی تھی تو اسی زمانے میں دلّی میں ادب اُردو کی محفل میں ایک نئی شمع روشن ہونے کو تھی، یعنی غالب کی شاعری کا آغاز ہونے والا تھا۔

اٹھارویں صدی مسیحی کے وسطی ثلث کا سیاسی بحران اور سماجی خلفشار برصغیر میں خانہ جنگیوں اور بیرونی حملہ آوروں کی تاخت اور لُوٹ مار سے مربُوط تھا۔ اس عہد کے اجتماعی محیط کی سطح پر جو تلاطم نمودار ہوا تھا، اس کی تہہ میں بہت سے وہ غیر مرئی تضادات و تناقضات مضمر تھے، جو فرسودہ رواج و رسوم کے باقی ماندہ جمود اور نئے حالات کے سیلانی تغیرات کے تقاضوں کے تصادم سے ظہور پذیر ہوئے تھے۔

انیسویں صدی مسیحی کے شروع ہوتے ہوتے ایک نئی عسکری قوت تمام دوسری عسکری قوتوں کے مقابل میں نمایاں طور پر برتر اور کامیاب نظر آنے لگی تھی اور وہ برطانوی قوّت تھی جو سات سمندر پھاند کر ہزاروں میل کے فاصلے طے کر کے مغرب سے مشرق تک پھیل چکی تھی۔ اس جدید عسکری قوت کی بنیاد جدید صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام پر تھی جس کے اثر سے برصغیر کے سماج میں تضادات و تناقضات بھی بڑھنے لگے تھے۔ بڑھتے ہوئے برطانوی عسکری تسلط اور سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ برصغیر میں خانہ جنگیاں ختم ہونے لگی تھیں اور اس عہد کے اجتماعی محیط کی سطح پر تلاطم میں کچھ کمی ہونے لگی تھی۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل و نصف اول کا زمانہ تھا۔ تلاطم میں کچھ کمی ہوئی تو سماجی تضادات و تناقضات مجتمع کی سطح پر کچھ واضح تر صورت میں نمودار ہونے لگے اور ایک گزرتے ہوئے عہد کے دھندلکے میں ایک نئے عہد کی پو پھٹتی ہوئی نظر آئی۔

ظاہر ہے کہ یہ تضادات و تناقضات اس سماج میں بھی تھے اور اس

سماج کے اجزائے ترکیبی یعنی اس کے افراد و اشخاص میں بھی یہ تضادات و تناقضات افراد کے گرد و پیش ان کے ماحول میں بھی تھے اور ان کے ذہنوں اور جذبات میں بھی ان کے اقدار و قیم میں بھی اور ان کے شعور و شعار میں بھی اور زندگی کے حالات اور طرزِ حیات میں بھی، خواہ وہ سطح کے اوپر رہے ہوں یا سطح کے نیچے جھلک رہے ہوں، بہرصورت وہ کارفرما ضرور رہے ہوں گے۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تضاد و تناقض وجود کے تار و پود میں موجود ہے یہ وہ تانا بانا ہے جو ہستی کی ہر سطح پر موجود ہے۔ تضادات و تناقضات کے باہمی ردّعمل کے نتیجے میں کل وجود ایک لامتناہی سلسلۂ تغیرات کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہستی ایک دائمی حرکت کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے، گو کہ مجرّد تغیر بھی ایک تخلیقی سلسلہ ہوتا ہے لیکن جب کسی تعمیری عمل یا تعمیری سعی کے نتیجے میں چونکا دینے والے تغیرات رونما ہوتے ہیں، بیشتر اسی وقت اس عمل یا سعی کو تخلیقی درجہ حاصل ہوتا ہے چونکہ اسی کے ضمن میں وہ نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بہتر استعداد پیدا کر دیتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں جو سیاسی بحران اور سماجی خلفشار رونما ہُوا تھا اور لاقانونیت کے پھیلنے سے جو ظلم و ستم ہُوا تھا، اس کے اثرات اُردو ادب کے صفحات پر جا بجا ملتے ہیں میرؔ نے اپنی آپ بیتی میں تو ان حالات و واقعات کی بہت سچی اور دلخراش تصویر پیش ہی کی ہے۔ لیکن ان کے کلیات میں بھی نہ محض اس کا عکس بلکہ اس عہد کی آہ و فریاد اور اس سماج کے کراہنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور ساتھ ساتھ طبقاتی تفاوت و فرق و اختلاف بھی ان کے اشعار میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے   یہ دھُواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

غرض کہ گذشتہ نسل کے مصائب اور غم و اندوہ کی رُوداد اور ان سے متعلق اس کے تاثرات سب ہی غالبؔ کی نسل کو میراث میں ملے تھے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل سے جو سیاسی اور سماجی تغیرات رونما ہُوئے، ان میں بڑھتے ہوئے برطانوی اقتدار و تسلّط کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یورپ کے ترقی یافتہ اور جدید صنعتی تمدن کے مقابلے میں نہ محض مادّی مقاومت ناممکن نظر آتی تھی بلکہ ذہنی سطح پر بھی مقابلہ مشکل معلوم ہونے لگا تھا۔ یورپی تمدن کے نظم و نظام و تنظیم کی حیرت انگیز استعداد کے مقابلے میں نہ محض عسکری مقاومت ناممکن معلوم ہوتی تھی بلکہ سماجی اور فکری میدان میں بھی اس سے مقابلہ کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ اور پھر ساتھ ساتھ شاید یہ بھی محسوس ہوتا ہو گا کہ اس حیرت انگیز نظم و تنظیم و انتظام ہی کے ذریعے ممکن ہے برصغیر کو کسی پہلو چین لینے کا موقع ملے۔ ایرانی و افغانی حملہ آوروں اور روہلوں، مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی یورشیں اور شورشیں کسی فیصلہ کُن نتیجے کے اسباب مہیا نہ کر سکی تھیں۔

دراصل یہ سب ایک فرسودہ اور قدیم اقطاعی اور جاگیرداری نظام کی آخری پریشان خوابی و پریشان خیالی تھی اور ایک ترقی یافتہ جدید صنعتی نظام کے سامنے ان فرسودہ قوتوں کا ٹھہرنا محال تھا۔ اس امر کی حقیقت کا احساس و شعور اس وقت جس قدر وضاحت سے غالبؔ کو تھا، شعرا و ادبا میں شاید اتنا کسی اور کو نہ تھا۔ چنانچہ اس کی جانب انہوں نے تقریر و تحریر دونوں میں نہ محض اشارہ کیا ہے بلکہ اس کا واضح اظہار کیا ہے کہ ایک ایسے جدید عہد کی آمد ہے جس میں قدیم اور فرسودہ افکار و عقائد اور پرانے طرزِ زندگی کی گنجائش نہ ہوگی۔

شاید اسی طرح کا واضح احساس و شعور تھا جس نے غالبؔ کے اندازِ فکر و بیان میں ایک فلسفیانہ کیفیت پیدا کر دی۔ شاید غالبؔ کو اس امر کی حقیقت کا

اس قدر شدید اور واضح احساس تھا کہ اس کے نتیجے میں وہ نہ تو اپنے پیشرو میرؔ کی طرح کسی امر یا شے سے گہری جذباتی وابستگی پیدا کر سکے اور نہ اپنے دو ہمعصروں، دبیر اور انیس کی طرح کسی رُوحانی و اخلاقی موقف میں محویت کی حد تک پہنچ سکے، بلکہ اکثر و بیشتر ان کا موقف اور ان کی وابستگی و محویت ایک زمانہ شناس و شوخ طبع فلسفی کی سی نظر آتی ہے جو گزرتے ہوئے سیلاب کے تلاطم و تموّج کا منظر ایک ایسی بلندی سے دیکھ رہا ہو جہاں سے اس سیلاب کا سرچشمہ ہی محض نظر نہ آتا ہو بلکہ وہ سمندر بھی نظر آ رہا ہو جس میں اس سیلاب کی متلاطم موجوں کا پیچ و تاب گم ہو جانے والا ہو۔ تاریخ انسانی کیا بلکہ کل وجود کا ایک نامعلوم ابدی حقیقت میں محو ہو جانا ان کی نظر میں ہو گا جب ہی تو وہ اپنے عہد کے تلاطم کو دیکھنے کے بعد بھی کہہ سکتے تھے کہ:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دُوا ہو جانا

اور فارسی میں اس بات کو ذرا اور وضاحت کے ساتھ یُوں بیان کر سکتے تھے کہ:

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وارسیم ہماں قلزمیم ما
پنہاں بعالمیم زبس عین عالمیم
چوں قطرہ در روانی دریا گمیم ما

اور اگر اُن سے کسی زیادہ مثبت بیان کا مطالبہ کیا جاتا تو ایک حزن آمیز لہجے میں جواب دیتے کہ:

دیگر زساز بیخودی ما صدا مجو   آوازی از گسستن تار خودیم ما

یعنی میں ہوں اپنی شکست کی آواز
مجھ سے اور کیا پوچھتے ہو۔

لیکن یہ ایسا جواب ہے جو غالبؔ کی فلسفیانہ عدم وابستگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ خستگی کا بھی ثبوت ہے۔ ان کی ذہنی آزادی کے باوجود ان کی دل گرفتگی بالکل واضح ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فلسفے کی خشکی میں ان کے شعر کی تازگی مُرجھا کے رہ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ نہ فلسفی رہتے اور نہ شاعر۔ یہی عقل و عشق کا تضاد اور جذبات و منطق کا تناقض غالبؔ کی غزل سرائی کے نغموں میں ایک ایسا توازن و اعتدال پیدا کر لیتا ہے کہ اُن کی آواز ایک جدید آواز معلوم ہوتی ہے اور ان کے کلام میں ایک مستقل تازگی محسوس ہوتی ہے۔

دبستان دلّی اور دبستان لکھنؤ

انیسویں صدی کے وسطی ثلث میں جب برصغیر میں برطانوی تسلّط و اقتدار تقریباً مسلّم و مستحکم ہو چکا تھا، اس وقت بھی گئی گزری حالت کے باوجود دلی کو ثقافتی و ادبی مرکزیت حاصل تھی۔ لیکن لکھنؤ بھی ادبی و ثقافتی لحاظ سے دلی کے برابر مرکزیت حاصل کر چکا تھا۔ تقریباً نصف صدی پہلے لکھنؤ کی جانب دلی سے اہل ہنر و دانش کھنچتے چلے آ رہے تھے۔ میرؔ اور سوداؔ اسی کی خاک کے دامن میں ابدی نیند سو رہے تھے اور میر حسن بھی۔ چنانچہ اُردو ادب و ثقافت کے دو مرکز اور دو دبستان اس طور پر قائم ہو گئے، دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ۔

دلی کے میرؔ و سوداؔ و دردؔ جیسے اساتذہ و متقدمین کے درمیان غزل

ہی سب سے مقبول صنفِ شعر تھی اور اسی صنف کو غالبؔ کے عہد میں دبستانِ دلّی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن اس کی فنی تکمیل کے باوجود "تنگنائے غزل" کو حدود و قیود سے آزاد اور لامحدود امکانات کا حامل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ تھی جو غالبؔ کے شاگرد حالیؔ نے بعض مضامین و موضوعات کے لئے صنفِ مسدس کی طرف توجہ کی۔ یہ صنف وہی تھی جسے سوداؔ نے مرثیہ سرائی کے لئے منتخب کیا تھا اور جسے دبستانِ لکھنؤ میں دبیرؔ و انیسؔ نے غالبؔ کے عہد میں نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن غزل سرائی کو دبستانِ لکھنؤ میں وہ تکمیل حاصل نہ ہوئی جو اُسے دبستانِ دلّی میں نصیب ہوئی، ممکن ہے دلّی کی تباہی بھی اس امر میں معین رہی ہو۔ شدید مصائبِ انسانی ذہن کو اکثر باطن کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور مشاہدۂ باطنی کے نتیجے میں جذبات کی گہرائیوں سے جو تاثرات ابلتے ہیں اور ادبی لہجے کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، وہ ایک اعلیٰ شعری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دلّی کے برخلاف لکھنؤ کو دلّی کے لٹنے کے بعد نہ محض ادبی و ثقافتی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی بلکہ مال و ثروت کا وہاں وفور تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کی بے فکر، فارغ البال اور خوش باش فضا میں وہ جذبات بظاہر معدوم تھے جو ذہن کو باطن کی طرف مائل کرتے ہیں۔ چنانچہ دبستانِ لکھنؤ کی غزل سرائی میں عموماً ایک سطحی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ دراصل لکھنؤ کے سماج کے دو رُخ تھے، اگر ایک رندی لئے تھا تو دوسرا روحانیت، اگر ایک رنگین مزاج تھا تو دوسرا اخلاقیات سے مستحکم، اگر ایک بادۂ غفلت سے سرشار تھا تو دوسرا اشعارِ اخلاقی سے بیدار، اگر ایک میں عیش و عشرت کی الاپ تھی تو دوسرے میں علمی چرچا، جہاں لکھنؤ کے ثروتمند و مقتدر طبقے کی فارغ البالی

نے اسے سنجیدہ زندگی سے دُور کر دیا تھا، وہاں لکھنؤ کے متوسط طبقے سے اہلِ علم و فکر اس ثروتمند طبقے کے پیدا کئے ہوئے متمول و متلاطم ماحول و محیط سے متنفر تھے اور یہی تضاد و تناقض ادب کی تخلیقی دنیا میں چونکا دینے والے تغیرات کا باعث ہُوا جہاں لکھنؤ کے ایک ماحول میں غزل سرائی نے رندی و شادی و طرب کو اپنا کر اپنی گہرائی کھو دی وہاں اس کے دُوسرے ماحول میں ان سے متضاد و متناقض عناصر یعنی روحانیت و اخلاقیات غم و دردمندی اور زحمت و تعب نے مسدس کی شکل میں مرثیہ سرائی کو عجیب و غریب فکری بلندیوں اور جذباتی گہرائیوں تک پہنچا دیا۔ یہ ادبی تخلیق غالبؔ کے ہمعصر دبیرؔ اور انیسؔ کے قلم سے صورت پذیر ہوئی۔ مرثیہ و مسدس کے عروج سے لکھنؤ میں غزل کی صنف اور بھی زیادہ ماند پڑ گئی۔

اس فرق کے نتیجے میں دلی میں تو ادبی و شعری قیادت غزل سرا شعرا ہی کے ہاتھ رہی لیکن لکھنؤ میں ادبی و شعری قیادت غزل سرا شعرا کے ہاتھ سے نکل کر مسدس نگار مرثیہ سرا شعرا کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

دونوں دبستانوں کا سیاسی پس منظر

ادبِ اردو کے ان دو دبستانوں کے موازنے کے لئے ان کے ایک دوسرے سے ذرا مختلف سیاسی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دلّی کے سماج میں کئی بار لٹنے پر، حالات سے مجبور ہو کر ایک حد تک راضی بقضا ہونے کا سا انداز پیدا ہو گیا تھا، لکھنؤ کے سماج میں ۱۸۵۷ تک اس درجہ یاس و قنوطیت رونما نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ بنسبت دلی کے لکھنؤ کے سماج نے جنگِ آزادی میں زیادہ مقاومت کا ثبوت دیا۔ ادب میں

نہ محض سیاسی وسماجی حالات کا انعکاس ہوتا ہے، بلکہ بعض مواقع پر ادب کی آواز سیاسی وسماجی حالات کو بھی متاثر کرسکتی ہے۔ دبیر اور انیس کے مراثی سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ شعوری یا کم از کم نیم شعوری طور پر ان کی شاعری میں نہ محض بیرونی تسلّط کے خلاف شدید جذبات مضمر تھے بلکہ ہر بانی ظلم وجور واستبداد کے خلاف وہ قوم وملّت کے جذبات کو اُبھارنے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ خیر وشر، حق وباطل، عدل وظلم کے بنیادی تضادات وتناقضات اور تصادم کی توضیح وتشریح اور تصویرکشی کے نتیجے میں ان کے قلم سے ایک متحرک ادبی تخلیق کی تشکیل ہوئی۔

اس کے برخلاف غالب نے نہ محض بیرونی تسلّط کو مجبور ہوکر تسلیم کیا بلکہ اس کی حقیقت وماہیت اور اس کے اسباب وعلل کو سمجھنے کے بعد اپنے مخصوص فلسفیانہ وصوفیانہ انداز میں اس کے جبروت وتشدد کو مسکرا کر یوں نظر انداز کردیا کہ:

نہ اتنا بُرّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خون وہ بھی

اور اگر اسے سن کر کسی نے زیادہ استفسار کرنا چاہا تو یہ کہہ کر اس کا منہ بند کردیا کہ:

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہنے پائے اپنا فلسفیانہ وصوفیانہ موقف اور اس طرح واضح کردیا:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

دراصل غالب تصوّف وحکمت کی اس فکری وجذباتی منزل تک پہنچ گئے تھے کہ دُنیا کے بڑے سے بڑے تغیرات ان کی نظر میں سماتے ہی نہ تھے۔ شاید وہ ایک ایسے فکری عالم میں رہتے تھے، جہاں زماں ومکاں کی محض اضافی و مجازی حیثیت باقی رہ گئی تھی۔

نہ تھا کچھ تو خُدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ظاہر ہے اس سطح حکمت وتصوّف پر پہنچنے کے بعد دُنیا کے سخت سے سخت حالات وواقعات کی کیا اہمیّت رہ جاتی ہے؟ چنانچہ سنیئے وُہ کیا کہتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

وہ دُنیا کے حالات سے اس درجہ مایوس ہوگئے تھے کہ ان کے خیال میں سخت سے سخت واقعات کا سامنے آنا کوئی بعید نہ تھا۔ وہ بد سے بدتر حالات کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اور ساتھ ہی ساتھ شاید غالب کی ذہین نگاہیں یورپ کے ترقی یافتہ جدید صنعتی تمدّن کے آثار وعلائم کو دیکھتے ہی اس کے وسیع امکانات کو بھی تاڑ گئی تھیں اور اپنے فرسودہ تمدّن کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب ہی کے عہد میں پہلی بار دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کا فرق واضح شکل وصورت میں نمایاں ہوا۔ البتہ یہ یاد رہے کہ اس وقت

تک دبستانِ لکھنؤ کی ادبی قیادت غزل سرا شعرا کے ہاتھ سے نکل کر مرثیہ سرا شعرا کے ہاتھ میں پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا لکھنؤ کے دبستانِ شعر و ادب کی نمائندگی کے لیئے مسدّس نگار مرثیہ سرا شعرا ہی کی جانب دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

دونوں دبستانوں کا اقتصادی و معاشی پس منظر

دلّی اور لکھنؤ کے ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف اقتصادی و معاشی پس منظر سے بھی کچھ ادبی امور وابستہ نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی ظاہر ہے کہ دلی کے کئی بار لٹنے کے نتیجے میں وہاں ایسی بدحالی تھی کہ غالب کو کہنا پڑا:

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟"

لیکن اس کے ساتھ ساتھ شدّت مصائب نے ایسی ہمّت شکنی کی تھی کہ غم و الم سے ایک گہرا لگاؤ پیدا کر دیا تھا۔ میرؔ اسی جذبے کا یوں اظہار کر گئے تھے۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اسی بات کو غالبؔ نے ذرا پر از حکمت انداز میں دھرایا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن ان اشعار میں جو بے پناہ یاس و قنوطیت ہے اس سے دل لرز جاتا ہے کہ آیا کیا کبھی انسان پر اتنے مصائب بھی ٹوٹ پڑے تھے کہ وہ مصائب سے اس حد تک مانوس ہو گیا تھا کہ ان کو بھی غنیمت تصوّر کرنے لگا تھا اور بغیر ان کے زندہ رہنا خوش گوار نہ تھا؟

پھر بھی ثروتمند اور مقتدر طبقے کے خلاف جو چنگاری دل میں دبی تھی

اسے بالکل بجھا دینا بھی ناممکن تھا۔ غالب کے پیش رو اور ایک لحاظ سے پیشوا، میرؔ کہہ گئے تھے۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

لیکن اس کے باوجود اس شعلے کو بجھانا ممکن نہ تھا۔

گو کسی دل جلے کی ہے یہ فلک — شعلہ اک روز یاں سے اٹھتا ہے

اور کیوں نہ اٹھتا جب طبقاتی تفاوت کا یہ عالم تھا کہ؛

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواران

چنانچہ اس ناانصافی سے بیزار ہو کر کہتے ہیں:

رکھے تاجِ زر کو سر پر چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاران

گو کہ میرؔ کی دلّی اور حافظ کے شیراز میں نہ محض بعدِ مکانی بلکہ صدیوں کا بعدِ زمانہ بھی تھا، لیکن دونوں کے سُر مل جاتے ہیں۔

تکیہ بر اختر شب گرد مکن کاین عیّار
تاجِ کاؤس ربود و کمر کے خسرو

لیکن غالبؔ کا لہجہ ان دونوں کے مقابلے میں نیا معلوم ہوتا ہے چونکہ ان کے صوفیانہ و عاشقانہ دل کے ساتھ ساتھ ان کا فلسفیانہ ذہن بھی کارفرما رہتا ہے۔ اور وہ حقیقت میں نظر سے دنیا کے حالات کو دیکھ کر ایک صاف اور سچ بات ایک طنزیہ انداز میں یوں کہتے ہیں جس سے طبقاتی تفاوت کا ظلم واضح ہو جاتا ہے۔

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب — بے ستون آئینہ خواب گران شیریں

اور پھر اسی گرسنہ مزدور اور اس کے تاجدار رقیب دونوں کی غفلت شعاری کی جانب ایسے بصیرت آمیز انداز میں اشارہ کرتے ہیں کہ شعر کی گہرائیوں میں انقلابی تلمیح محسوس ہونے لگتی ہے۔

این چرا در تعب و آن زچہ رو در طرب است
خندہ بر غفلت درویش و توانگر دارم

اور پھر ایک جگہ حیرت انگیز مارکسی تحلیل و تشریح کے انداز میں کہتے ہیں۔

ای گل تر برنگ و بو این ہمہ نازشں از چہ رد
منت ابر یک طرف مزد چمن طرازدہ

لیکن خوش قسمت اور خوش حال لوگوں سے یہ کہنے کے ساتھ ساتھ خالق کائنات و رازق ہر ذی حیات کی طرف متوجہ ہو کر ایک سوالیہ لہجے میں کہتے ہیں:

نکبتیان ترا قافلہ بے آب و نان   نعمتیان ترا مائدہ بے اشتہا

اور پھر اسی شوخی کے انداز میں حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس عہد میں دبستان لکھنؤ کے مسدّس نگار مرثیہ سرا شعرا کی نظر ان کے سماج کے تناقضات و تضادات پر تنقیدانہ انداز میں پڑنے لگی تھی اور اسلام کے اخلاقی شعار کی روشنی میں انہوں نے ان ہی کی تشریح و توضیح و تنقید سے ایک تخلیقی ادب کی تشکیل کی۔ چنانچہ مرزا دبیر نے ایک مرثیے میں خالق کائنات کے عدل و جلال و جبروت کی ایسی تصویر کشی کی کہ اُسے سُن کر امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ وقت، کانپ گئے، اور ان کا رومال خوف الٰہی میں آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اور اس کے بعد ہی انہوں نے ادارہ ردّ مظالم قائم کیا۔

خدا کے حضور میں بادشاہوں کی عبرت ناک حالت کا ذکر کرتے ہوئے دبیر نے جو تصویر کشی کی ہے اس کی دو جھلکیاں دیکھئے۔

جب روز کبریا کی عدالت کا آئیگا   جبّار بادشاہوں کو پہلے بلائیگا

اور پھر دوسری جگہ:

گردوں اُڑے گا پنبۂ حلاّج کی طرح
قبروں سے شاہ نکلیں گے محتاج کی طرح

طبقاتی تفاوت اور ثروتمند و مقتدر طبقے کے مقابلے میں انسانی وقار کی ترجمانی کرتے ہوئے اُنیس نے عوام الناس کا حوصلہ یوں بڑھایا کہ:

فقیروں نے یاں پاؤں پھیلا دیئے ہیں
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

اور اسی انسانی وقار کے جذبے کے زیر اثر اہل مال و ثروت کو بڑے کڑے تیور اور محکم لہجے میں یوں مخاطب کیا کہ:

وہاں کینہ زہ بند رکھ پرائے منعم   خدا کے واسطے واکر جبیں کی چینیوں کو

ہماری روزمرہ کی زبان میں ہم اس بات کو شاید یوں کہتے ہیں کہ اگر تو نے عوام کا مال ہضم کر لیا ہے اور ان کو ان کا حق واپس نہیں کرتا تو نہ کر لیکن خدا کے لئے خدا کی بنائی ہوئی شکل کو نہ بگاڑ!

ثروت اندوزی کی نہ محض مذمت بلکہ تحقیر کرتے ہوئے اپنے سماج کے ثروتمند طبقے کو انیس نے یوں سمجھایا کہ واقعہ نگاری کے دوران اپنے ممدوح کی زبان سے یہ کلمات جاری کئے۔

بیٹھے نہیں زمیں میں خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

لیکن کبھی کبھی اہلِ زر و اقتدار کے نخوت و تکبر کے خلاف اس سے
کہیں زیادہ سخت لہجے میں یہ انقلابی پیشین گوئی بھی کی کہ :

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اُن کے سَر
آج نخوت سے زمین پر جو قدم رکھتے نہیں

دبستان لکھنؤ کے مسدس نگار مرثیہ سرا شعرا کا ایک اور زرّیں اصول یہ تھا کہ وہ امرا و رؤسا اور بادشاہِ وقت کی تعریف میں شعر کہنا اپنے لئے نہ محض تضیع وقت سمجھتے تھے بلکہ اپنے لئے اسے دون مرتبت اور اپنے انسانی شرف و وقار کے منافی تصوّر کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے غیرازِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کسی کی تعریف سے اپنی زبان کو آلودہ نہ کیا۔

غالبؔ کو البتہ بمجبوری اُمرا و رُؤسا اور بادشاہ وقت ہی نہیں بلکہ برطانوی حکام اور ملکہ برطانیہ کی مدح بھی کرنا پڑی۔ لیکن اُن کے اندازِ کلام سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ نہ محض مجبوری اُن کو یہ کرنا پڑا بلکہ شاید وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انسانی فطرت کی یہ ایک طفلانہ خواہش ہے چلو اُسے پُورا کردو اور اپنا کام نکال لو۔ ان کی نظر میں یہ سب وقت کے دھارے میں فنا کی طرف بہے چلے جاتے تھے، اور اس ابدی و ازلی حقیقت کے سامنے نہ وہ خود باقی رہنے والے تھے اور نہ اُن کی تعریف و ستائش یہاں تک کہ کل کائنات معرضِ فنا میں ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذار بادیاں

غالبؔ کی صوفیانہ و فلسفیانہ نظر میں نہ محض ایک ملک کی تاریخ بلکہ تمام نوعِ بشر کی تاریخ اور نہ محض انسانی تاریخ بلکہ تمام کائنات کا حدوث و وجود ایک پُراسرار معمّہ ہے جو اس ناقابلِ تخیل حقیقتِ مطلقہ کے سامنے جسے چاہے

خالقِ کل کہیے، چاہے علت العلل، بے حقیقت نظر آتا ہے۔ اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ فنا کی حقیقت ہے، ہر شے فنا ہوگی اور اس اصلی حقیقت کی طرف پلٹ جائے گی جو وجود وحدت کی علتِ اُولیٰ ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ظاہر ہے اس طرح کے افکار و خیالات پر مبنی کسی فعّال و عملی زندگی کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ لیکن خواہ قدیم دینی عقائد کی بنا پر دیکھا جائے، خواہ جدید کائناتی نظریات (COSMOLOGY) کے لحاظ سے غور کیا جائے غالبؔ کے ان اشعار میں بہت کچھ حقیقت ضرور نظر آنے لگتی ہے۔

لیکن اس تصوّف و فلسفے کے باوجود غالبؔ اس دُنیا کی رنگینی سے روگرداں نہیں نظر آتے بلکہ اس میں محو معلوم ہوتے ہیں۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا!

وہ مشاہدہ حسنِ فطرت و کائنات کو تنگ نظری و تنگ دلی کا بہترین مداوا سمجھتے ہیں۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے محوِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو



غبار طرف مزارم پیچ و تابی ہست
ہنوز در رگ اندیشہ اضطرابی ہست
میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

لیکن مادی دُنیا کا مشاہدہ بھی ان کو تصوّف کے نکات کی طرف پلٹا لاتا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ھائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالبؔ کا عہد اُردو ثقافت کے لئے ایک نئے دور کی ابتدا تھی۔ جہاں دبستان لکھنو کے مسدّس نگار مرثیہ سرا شعرا یعنی دبیرؔ اور انیسؔ نے اردو ادب اور ثقافت کو ایک وسیع تر اور آزاد فضا میں پہنچا دیا، وہاں غالبؔ کی غزل سرائی نے حکیمانہ بصیرت و آفاقیت کا اس میں اضافہ کر دیا اور مدتوں آنے والوں نے اس عہد کی اقتدا و تقلید میں تکمیل فن ادب کے لئے کاوشیں جاری رکھیں جو اس وقت ادب اردو کا سرمایہ بن چکی ہیں۔

تخمیس سلام میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

از سیّد محمد امیر امام حرؔ

سلام اسے کہ شہید وفا کہیں اس کو
سلام اسے کہ امام ہدیٰ کہیں اس کو
سلام اسے کہ شہ دوسرا کہیں اس کو
سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

جہانِ غم میں طرب کی کہاں نمائش ہے
کہو بلاؤں میں کس دل کی آزمائش ہے
یہ کس کے دم سے مسرّات کی کشائش ہے
نہ بادشاہ نہ سلطاں یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامس آل عبا کہیں اس کو

یہ حُبِّ جاہ تلبیس شوروی کیسی
بفکرِ دینوی تعبیر اُخروی کیسی
یہ راہِ راست میں ذہنوں کی کجروی کیسی
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی

کہو کہ رہبرِ دینِ خدا کہیں اس کو

وہ غم رسیدہ جو تھا غمگسار بندوں کا
وہ جس کے غم نے بڑھایا وقار بندوں کا
اسی کا عزم بنا افتخار بندوں کا
خدا کا بندہ خداوندگار بندوں کا

اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو

ثباتِ حق سرِ میداں حسینؑ ابنِ علیؑ
ثبوتِ حجتِ یزداں حسینؑ ابنِ علیؑ
رسولِ حق کے دل و جاں حسینؑ ابنِ علیؑ
فروغِ جوہرِ ایماں حسینؑ ابنِ علیؑ

کہ شمعِ انجمن کبریا کہیں اس کو

وہ استقامتِ حق روبروئے استبداد
شکن بھی عزم کے رُخ پر نہ تھی کجا فریاد
ہے کس میں تاب کہ دہرائے درد کی رُوداد
ہمارا منہ ہے کہ دیں اسکے حسن صبر کی داد

مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

ہر ایک ذرّۂ راہِ وفا ہے عرش پسند
ہر ایک ذرّے کے ہیں ماہ و آفتاب سپند
ہے باز چشمِ تحیّر زبان نطق ہے بند
بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند

بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو

رہِ نجات ہو گم دل کا مدّعا نہ ملے
ہجومِ یاس میں امید کی ہوا نہ ملے
جہانِ درد میں پھر کوئی آسرا نہ ملے
ہمارے درد کی یا رب کبھی دوا نہ ملے

اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

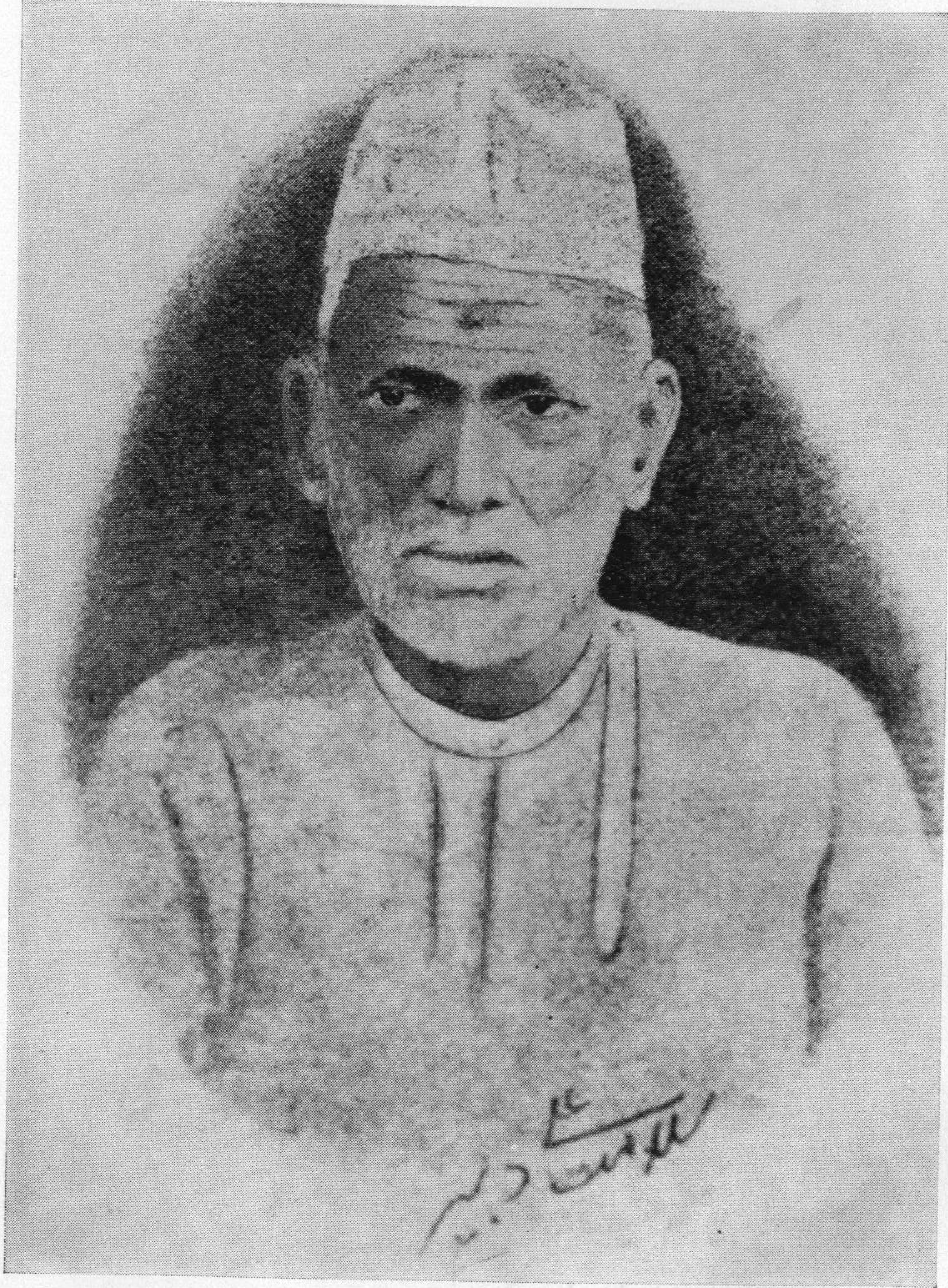
سمجھ میں آئے نہ اخلاق و عقل کے آئیں
اصولِ فقہ ہیں سختی کے ساتھ ذہن نشیں
نہیں جو عدل تو فتووں میں اعتدال نہیں
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں

علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

جہانِ درد میں مُحَرّ ہے ہر اِک پیام میں درد
ہر ایک بات میں دکھ ہے ہر ایک کام میں درد
ہے درد و غم سے شہیدِ وفا کے نام میں درد

بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد

غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو



نجف کا ذرہ نہ دوں آفتاب کے بدلے
نہ لوں میں عرش درِ بوتراب کے بدلے

میرزا اسلامت علی دبیر

تخمیس سلام مرزا سلامت علی دبیرؔ علی اللہ مقامہٗ

از سیّد محمد امیر امام حُرؔ

حبّذا شانِ عدل و دادِ علیؑ
ہے مداوائے غم و دادِ علیؑ
حقِ مطلق ہے اجتہادِ علیؑ

مجرئی یادِ حق ہے یادِ علیؑ

لوحِ دل پر ہے ثبت نادِ علیؑ

علم سرمایہ حلم جاہ و حشم
کلِّ ایمان و عینِ عدل و کرم
درسِ ایثار سیرتِ محکم

ہیں علی خانہ زادِ ربِّ حرم

زادِ ایماں ہے خانہ زادِ علیؑ

نورِ حق نورِ عدل حیدر ہیں
آپ اس راستہ کے رہبر ہیں
جس کے ذرّے بھی ماہ و اختر ہیں
خلد و طوبےٰ و نہر کوثر ہیں
کاغذ و خامہ و مدادِ علیؑ

امن گستر جہاد میں غالب
مہرِ تابندۂ ابو طالبؑ
جس کی دانش کا دین ہے طالب
چار عنصر ہیں دین کے قالب
فضل و احسان و عدل و دادِ علی

راستی کیا ہے بینشِ رہبر
معرفت کیا ہے فکرِ عدل سیر
حق ہے روشن ہے سارے عالم پر
خلد کیا ہے محبتِ حیدرؑ
قعرِ دوزخ ہے کیا عنادِ علیؑ

دل میں تھی عدل و جود کی وہ اُمنگ
دیکھ کر جس کو عقل و ہوش ہیں دنگ
فیض و بذل و عطا میں کی نہ درنگ
تیغ سائل کو بخش دی دمِ جنگ
کیا خدا پر تھا اعتقادِ علیؑ

ماورائے جہان نجم و سدیم
ماورائے تفہّم و تفہیم
بین نفس نفیس و عقل سلیم
ایک گوشہ ہے جس کا ہفت اقلیم
غیب میں ایسے ہیں بلادِ علیؑ

تخمیس سلام میر ببر علی انیسؔ

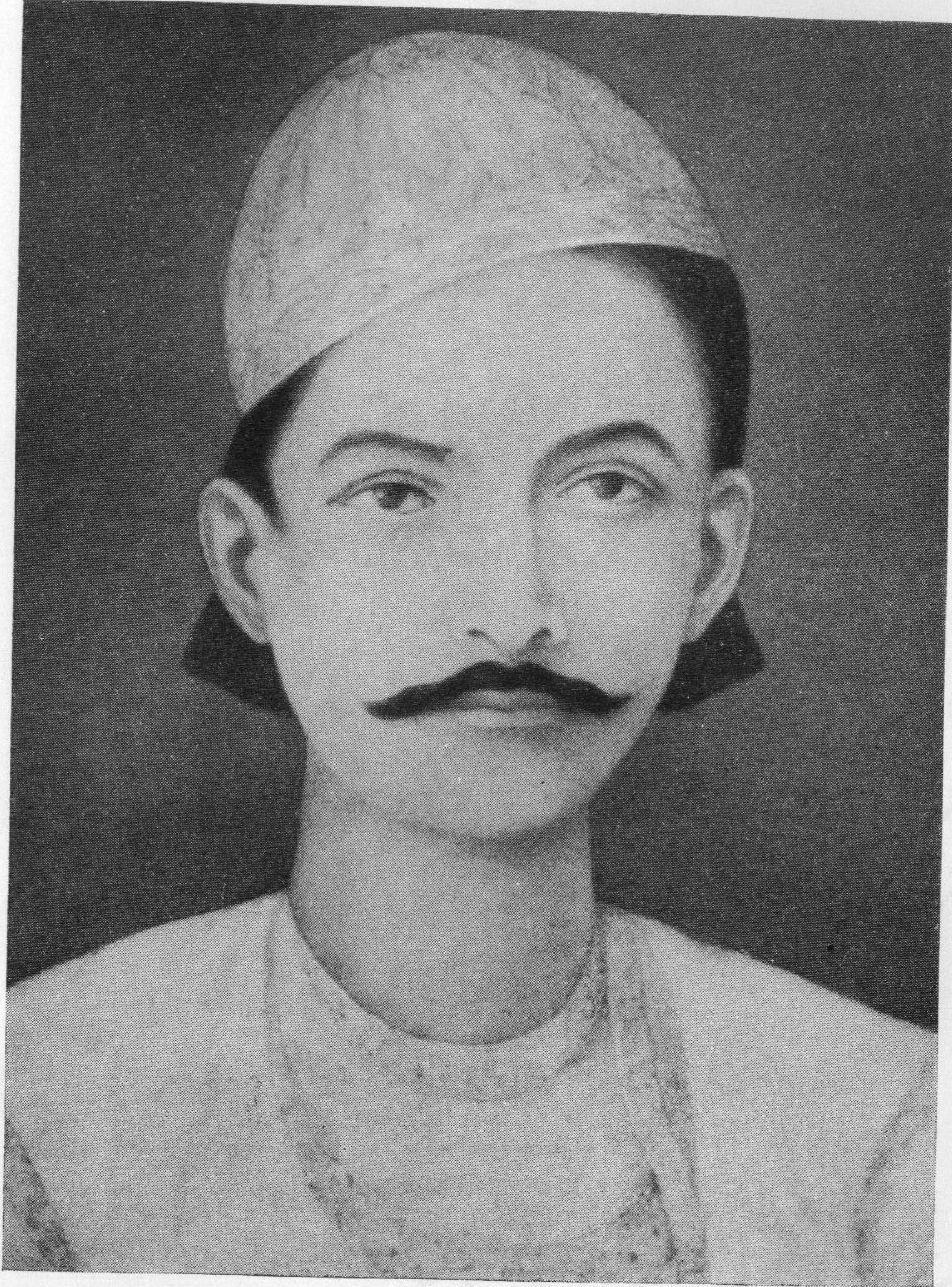
از سید محمد امیر امام حرؔ

محتشم ہیں گو کہ ہم جاہ و حشم رکھتے نہیں
ہیں غنی دل کے خیال بیش و کم رکھتے نہیں
غیر از درد محبت اور الم رکھتے نہیں

رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں
جز غم آلِ عبا ہم اور غم رکھتے نہیں

صاحبان دل ہیں بندے علم کی درگاہ کے
اہل حق بھوکے نہیں اعزاز و مال و جاہ کے
وہ غنی ہیں راہرو ہیں جو وفا کی راہ کے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں



خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

میر ببر علی انیسؔ

اہلِ ثروت سیم و زر پر مارتے ہیں چن کے ہاتھ
کھینچ لیتے ہیں کلامِ اہلِ حاجت سُن کے ہاتھ
آتشِ زر سے نہ رہ جائیں کہیں جل بھن کے ہاتھ
جو سخی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہلِ دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں

تیغِ حرّیت سے کٹ جائیں گے استبداد و شر
ہوں گے جنبانِ انقلابِ دہر سے سب دشت و دَر
کانپ اُٹھیں گے جلالِ عدل سے سب اہلِ زر
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

مدح سے آلِ محمدؐ کی مشرف ہے زباں
ثبت کر دی ہے دلوں پر شہ کے غم کی داستاں
فکر کے جلوؤں سے روشن ہیں زمین و آسماں
یہ دوات و خامہ ہے ملکِ فصاحت کا نشاں
کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

عابدِ بیمار کے اس عزم کا ہو کیا بیاں
وہ غم و رنج و الم، وہ ضبط فریاد و فغاں
ناتوانی جسم کی اور دل کی وہ تاب و تواں

کہتے تھے سجاد کھنچ سکتی نہ تھیں جب بیڑیاں
کیا کروں اس بوجھ کی طاقت قدم رکھتے نہیں

یہ فصاحت یہ روانی یہ مضامینِ نفیس
یہ تخیّل کی بلاغت حسن یہ الفاظ سلیس
شعر سے ظاہر ہے تھا سب شاعروں کا وہ رئیس

مرثیہ اک دن میں کیا سب کہہ کے اُٹھو گے انیسؔ
ہاتھ سے کیوں آج قرطاس و قلم رکھتے نہیں

تخمیسؔ سلام میر ببر علی انیسؔ

از سیّد محمّد امیر امام حرؔ

نہ برق قہر گری سر پہ نے عتاب آیا
لحد میں چین سے پھر بھی نہ مجھ کو خواب آیا
نہ کوئی بات بنی اور نہ کچھ جواب آیا

لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا
گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا

ظہور جلوۂ باقی ہیں حادث و فانی
حدوث ہو کہ قدم ہے ہر اک کی اصل وہی
نمود و بود ہے خود بحرِ سرمد ہستی
جگہ نہ پائی جو کثرت میں سانس لینے کی
میانِ بحرِ فنا دم بخود حباب آیا

وہ دشت ماریہ وہ فاطمہ کے دل کا چین
وہ تاب وتب وہ تپش وہ نبی کا نُورُ العین
"دریگانۂ دریائے مجمع البحرین"
فلک پہ شور تھا پہونچے جو کربلا میں حسینؑ
اب اپنی خاک پہ فرزند بوتراب آیا

جفا و جور نے دوراں میں آگ بھڑکا دی
ستم نے عالم امکاں میں آگ بھڑکا دی
غم و الم نے رگ جاں میں آگ بھڑکا دی
عطش نے گو دل سوزاں میں آگ بھڑکا دی
مگر زباں پہ نہ حرف سوالِ آب آیا

وہ امتحانِ وفا روز محشر عاشور
وہ کربلا کی فضا میں جلال حق کا ظہور
وہ روشنی تھی کہ تھا جس سے سب جہاں معمور
حسینؑ و حرؓ کی ملاقات تھی کہ عالم نور
اِدھر سے ماہ بڑھا تھا کہ آفتاب آیا

بڑھا شہادت حق سے حسینیت کا اثر
جلالِ عدل سے خود جُھک گیا یزید کا سر
دلوں میں ہیبتِ حق سے بپا ہوا محشر
سرِ حسین گیا شام میں بوقتِ سحر
ہوا یہ شور کہ نیزے پہ آفتاب آیا

ملی تھی مہلت یک لمحہ جس کو کھو کے چلے
تمام آرزوؤں سے بھی ہاتھ دھو کے چلے
سرشک یاس سے دامانِ دل بھگو کے چلے
جہاں سے ہم اسی حسرت میں پیر ہو کے چلے
نہ عمر رفتہ پھر آئی نہ پھر شباب آیا

انانیت سے ہوئی ہے کسے بقا حاصل
یم حدوث میں کس کو بھلا ملا ساحل
یہ پوچھو ان سے جو تھے صاحبان دریا دل
نہ سر اٹھائیو بحر فنا میں اے غافل
صدا یہ دے گیا پانی پہ جب حباب آیا

خودی کا نشۂ تھا پل بھر کبھی نہ یہ جاگے
بنی نہ بات تو مضمون غیر لے بھاگے
نہ ٹوٹ جائیں کہیں فکر خام کے دھاگے
الٹ کے سب مرے مضموں پڑھے مرے آگے
مزہ تو یہ ہے کہ اس پر مجھے حجاب آیا

اٹھا وہ جامعۂ علم جو کا اک طبقہ
رہا نہ حرؔ وہ دل خلق خو کا اک طبقہ
گیا جہاں سے گروہِ نکو کا اک طبقہ
الٹ گیا نہ فقط لکھنو کا اِک طبقہ
انیسؔ ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

تخمیسِ سلامِ میر ببر علی انیسؔ

از سید محمد امیر امام حرؔ

ہم اپنے دل سے فرائض کو یوں بھلا کے چلے
روا روش میں حقوقِ بشر مٹا کے چلے
نہ جانے کتنے دلوں کو یہاں دکھا کے چلے
گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

نہ غم گیا نہ طبیعت ہوئی بحال کبھی
دکھے دلوں کا نہ دل سے گیا خیال کبھی
کسی کے دل کو نہ ہم سے ہوا ملال کبھی
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

کدورتوں سے بری ہیں قلوبِ اہلِ ولا
کہ خاکساری سے پائی ہے آئینوں نے جلا
علوِّ نفس بشر ہے فروتنی کا صلہ
ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے

تھا گاہوارۂ ہیجا زمین کا طبقہ
ہلا نہیب سے سارا زمیں کا طبقہ
فلک لرز گئے کیا تھا زمیں کا طبقہ
ملک پکارے کہ اُلٹا زمین کا طبقہ
حسین فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

عجب ہوا وہ تھی اس دشت پر بلا کی ہوا
ولا کا پھول جہاں موسمِ خزاں میں کھلا
ہوائے خلد لیے تھی فضائے کرب و بلا
خیال آگیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے

ہجومِ حزن میں جب بھی لیا حسین کا نام
کئے نثار گہر آنسوؤں کے بہرِ امام
وقارِ صبر یہ تھا نام کو نہ تھا کہرام
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیتِ انام
مزارِ شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے

بہت عزیز ہے دنیا نگاہ دنیا میں
یہ عبرتیں بھی ہیں شام و پگاہ دنیا میں
فنا ہے جلوۂ ہر گاہ گاہ دنیا میں
قیام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

غرض نے رسمِ مروت مٹائی عالم سے
وہ کچھ امید جو باقی تھی عشق کے دم سے
اب اُٹھتی جاتی ہے وہ خو بھی نسلِ آدم سے
تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

بقا کی فکر میں کیا حَرّا اِدھر اُدھر جاؤ
فنا کے جھونکوں سے بچ کر بھلا کدھر جاؤ
عدم کی رات ہے گھیرے ہوئے جدھر جاؤ

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے



شاہوں کو مبارک ہو شرف تاجوری کا
تمغہ ہے سیادت مری عالی گہری کا

نواب سیّد امداد امام آثرؔ

تخمیس قصیدۂ سیّد امداد امام صاحب اثرؔ

از سیّد محمّد امیر امام حُرؔ

جز بپیش رب چرا پیش کسی باشم خجل
ساغرم با فیضِ رزاقِ جہاں شد متصل
نیست ترکیبِ خم صہبائے من زین آب وگل

آرزوئے جام جمشیدی بروں سازی زدل

قطرۂ نوشی اگر از جام استغنائے من

سوخت از برق دلِ من خار زار احتیاج
سروِ آزادم پس آزادم زبارِ احتیاج
کے شود طبعِ غیور من دوچار احتیاج

پُر الم گردد سرم کے از خمار احتیاج

لخت ہائے دل گزک خون جگر صہبائے من

طائر فکر مرا پرواز بی بال و پر است
نَے و بالِ آشیان نے احتیاج شہپر است
بی ہوا و بی نیاز و بی متاع و بی زر است

از سپہر آرزو پرواز او بالاتر است

کے بدام حرص افتد گردنِ عنقائے من

علم آب و دانہ باشد فکر باشد حاصلم
عرش باشد آشیانم سدرہ باشد منزلم
در فضا چون محو پروازم ز غم ہم غافلم

کے بمردارِ جہان رو افگند نسرِ دلم

کے خورد جیفہ ہمائے ہمت بالائے من

قلب من از نورِ عرفان چونکہ دارد سوز و ساز
نیست در فکر حقیقت سنج من ذکرِ مجاز
برق جذبم از فروغ حق بود عالم گداز

من کجا بر چہرہ دنیا گذارم چشم آز

ریخت رنگ آرزو پیش طبع بی پروائے من

بوئے خوش محصور نبود در گل و مشک و عبیر
طلعت او کے بود در قبضۂ ماہِ منیر
روحِ آزادم نباشد در حدودِ تن اسیر

نقش ہمرنگی ندارد خوردہ بر من مگیر
معنی پنہانِ من با صورت پیدائے من

در ہوا الماس باشد دُر بروئے سبزہ زار
بر فلک خندد و گرید بر فراز کوہسار
قطرۂ از فیض امواجش بود ابر بہار

در حقیقت، ہستیم بحریست ناپیدا کنار

کار با ساحل ندارد موجۂ دریائے من

در محیطم قلزم ذخّار باشد قطرۂ
دورِ آفاق است در زنجیر من یک حلقۂ
کم نمی گردد خروش جذبۂ من شمّۂ

بر سپہر وحشتم خورشید باشد ذرّۂ

بہر محشر بس بود یک گوشۂ صحرائے من

شہر علم و معرفت را فکر او چون بود باب
از فروغ جلوہ اش ہر ذرۂ شد آفتاب
شد نثار راہ حق ہم کہکشان ہم ماہتاب
تا کشیدہ سرمہ از خاک پائے بوتراب
غیر حق دیگر چہ بیند دیدۂ بینائے من



زہے عروج و شرف آسماں جناب ہوں میں
خوشا نصیب غلام ابوتراب ہوں میں
محمد علی محمد خاں محب مہاراجہ محمود آباد

تخمیس سلام

محمدؐ علی محمدؐ خاں محبؔ (اعلی اللہ مقامہ) مہاراجہ محمود آباد

از سیّد محمد امیر امام حُرؔ

عیش کی ناپائیداری قلبِ مضطر میں نہیں
محوِ حق ہوں دل مئے و مینا و ساغر میں نہیں
وہ سبک سر ہے الم جس کے مقدر میں نہیں

دل سے جو گریاں غمِ سبطِ پیمبر میں نہیں
نام اس کا خازنِ جنّت کے دفتر میں نہیں

آبرو کی آب و تاب الماس و گوہر میں نہیں
ظرف میں گہرائی جتنی ہے سمندر میں نہیں
وسعت دل حاسدانِ کینہ پرور میں نہیں

معترف ہوں میں شمار اہل جوہر میں نہیں
خود پرستی کا جنوں لیکن میرے سر میں نہیں

گو لہو کے گھونٹ اکثر غصہ و غم میں پیے
سامنے کم فہم کے کب یہ ہنر ظاہر کیے
پاسِ وضعِ صاحبانِ دل سے ہونٹ اپنے سیے
حاسدوں کی یاوہ گوئی سُن کے چپ ہوں اس لئے
خود ستائی کا چلن اربابِ جوہر میں نہیں

خوئے بد بھی ساتھ رہتی ہے بشر کے تا بگور
نفس کی گتھی سے رہتا ہے ہمیشہ دل میں چور
ختم ہو جاتا ہے فطری اہلیت کا زور و شور
صحبتِ بد خام کو کج رو بناتی ہے بزور
خود شکن دینے کی قدرت تارِ مسطر میں نہیں

سرمدی ہے دل ہے فانی جسمِ آب و گل مرا
ہے ازل سے تا ابد ماضی و مستقبل مرا
دل کی وسعت میں کہیں پیدا نہیں ساحل مرا
بحرِ ناپیدا کنارِ معرفت ہے دل مرا
جتنی اس کوزے میں وسعت ہے سمندر میں نہیں

ہر سحر رحمت سے اس کی مل رہی ہے بے حساب
فلک سے روشن مئے رنگیں بجامِ آفتاب
قلبِ مستغنی کو ہے بزمِ طرب سے اجتناب
کیوں پیوں رندِ حقیقی ہو کے دنیا کی شراب
کیا مرا حصہ مئے تسنیم و کوثر میں نہیں

حکمت و عرفانِ حق تھا ساز و سامانِ علیؑ
دولتِ دنیا سے مستغنی رہی شانِ علیؑ
اہلِ حریت کے ہاتھوں میں ہے دامانِ علیؑ
کیوں جھکیں شاہانِ عالم سے ثنا خوانِ علیؑ
تختِ شاہی میں صفت کیا ہے جو منبر میں نہیں

ہر عمل تھا درسِ مجمل، خلق اکمل، بے مثال
حجتِ حق، عدلِ مطلق، صدقِ محکم، لایزال
خوبیٔ کردار تھی خود فکرِ عرفانی پہ دال
پیروی بھی فردِ اکمل کی ہے محتاجِ کمال
یہ شرف جہلِ مرکب کے مقدر میں نہیں

عدل گستر ذرہ پرور تاجدارِ اِنَّمَا
حق سیرِ عالی گہر مسند نشینِ ھل اتیٰ
زورِ بازوئے پیمبر شہسوارِ لافتیٰ
اصل تو یہ ہے خدائی اور نبوت کے سوا
کون اوصاف و محاسن ہیں جو حیدر میں نہیں

وہ خدیجہ کا شرف وہ رفعتِ بنتِ نبی
ماں کی سیرت میں ڈھلی تھی سیرتِ بنتِ نبی
صرف خیرات و عطا تھی ثروتِ بنتِ نبی
کہتی تھی اسماء نثارِ غربتِ بنتِ نبی
حد یہ ہے ستّر سے کم پیوند چادر میں نہیں

روزِ عاشورا کی وہ گرمی بہنگامِ زوال
تین دن کی پیاس سے چھوٹے بڑے تھے خستہ حال
کیا بیاں ہو دل پہ طاری تھا جو اندوہ و ملال
کہتی تھی بانو پڑے ہیں پیاس کے مارے نڈھال
آج طاقت گھٹنوں چلنے کی اصغر میں نہیں

کہتی تھی زینبؑ سے عباسِ دلاور کیا ہوئے
پوچھتی تھی ماں سے گھبرا کر برادر کیا ہوئے
دیر سے آئے نہیں خیمے میں اکبر کیا ہوئے
شہ سے کہتی تھی سکینہ رو کے اصغر کیا ہوئے
گاہوارے میں نہیں آغوشِ مادر میں نہیں

تھے قدم میں کوثر و تسنیم و جنّاتِ نعیم
پھر بھی تھا مجبور وعدے سے کریم ابنِ کریم
اللہ اللہ وہ صعوباتِ صراطِ مستقیم
تشنگی میں شہ نے طے کی منزلِ ذبحِ عظیم
امتحانِ صبر دیکھو آب خنجر میں نہیں

فکرِ حسرؔ فکرِ محب سے پا کے جوہر آگئی
فیض سے محبوب و حب کے تا بمنبر آگئی
اوج پایا طبعِ حسرؔ نے تا بکوثر آگئی
دل سے مدحِ ساقیِ کوثر زباں پر آگئی
بادۂ جوشِ ولا کو چین ساغر میں نہیں

تخمیس سلام

محمد علی محمد خاں محبؔ (اعلی اللہ مقامہٗ) مہاراجہ محمود آباد

از سید محمد امیر امام حرؔ

بے سبب دریائے غم میں پیچ و تاب آتا نہیں
یوں ہی لے کر حشر کا دن آفتاب آتا نہیں
دہر میں بے وجہ شاہوں پر عتاب آتا نہیں
سادہ لوحوں کی سمجھ میں یہ حساب آتا نہیں
دل نہیں پھرتے تو ہرگز انقلاب آتا نہیں

ہیں کہاں فغفور و قیصر ہیں کہاں کسریٰ و کے
ڈھا گیا قصرِ یزیدی مٹ گئی جاگیر رے
عدل کی برق آسماں سے گر چکی ہے پے بہ پے
ختم حجت ہو چکی اے منتقم کیا دیر ہے
نجد کے مرقد شکن پر کیوں عتاب آتا نہیں

ہے علیؑ کے فیض سے عالم میں کیا عطف و وداد
جس کے دم سے ہو گیا بغض و حسد کا انسداد
دیکھنا تو یہ کمال و انتہائے عدل و داد
دوست دشمن سب کو مل جاتی ہے منھ مانگی مراد
کون سرکارِ علیؑ سے کامیاب آتا نہیں

کیا فقط ہیں بہرِ ماتم واقعاتِ کربلا؟
ہیں بنائے عزم محکم واقعاتِ کربلا!
تازہ رکھتے ہیں سدا غم واقعاتِ کربلا!
یاد آجاتے ہیں جس دم واقعاتِ کربلا
ہم کو پہروں بسترِ راحت پہ خواب آتا نہیں

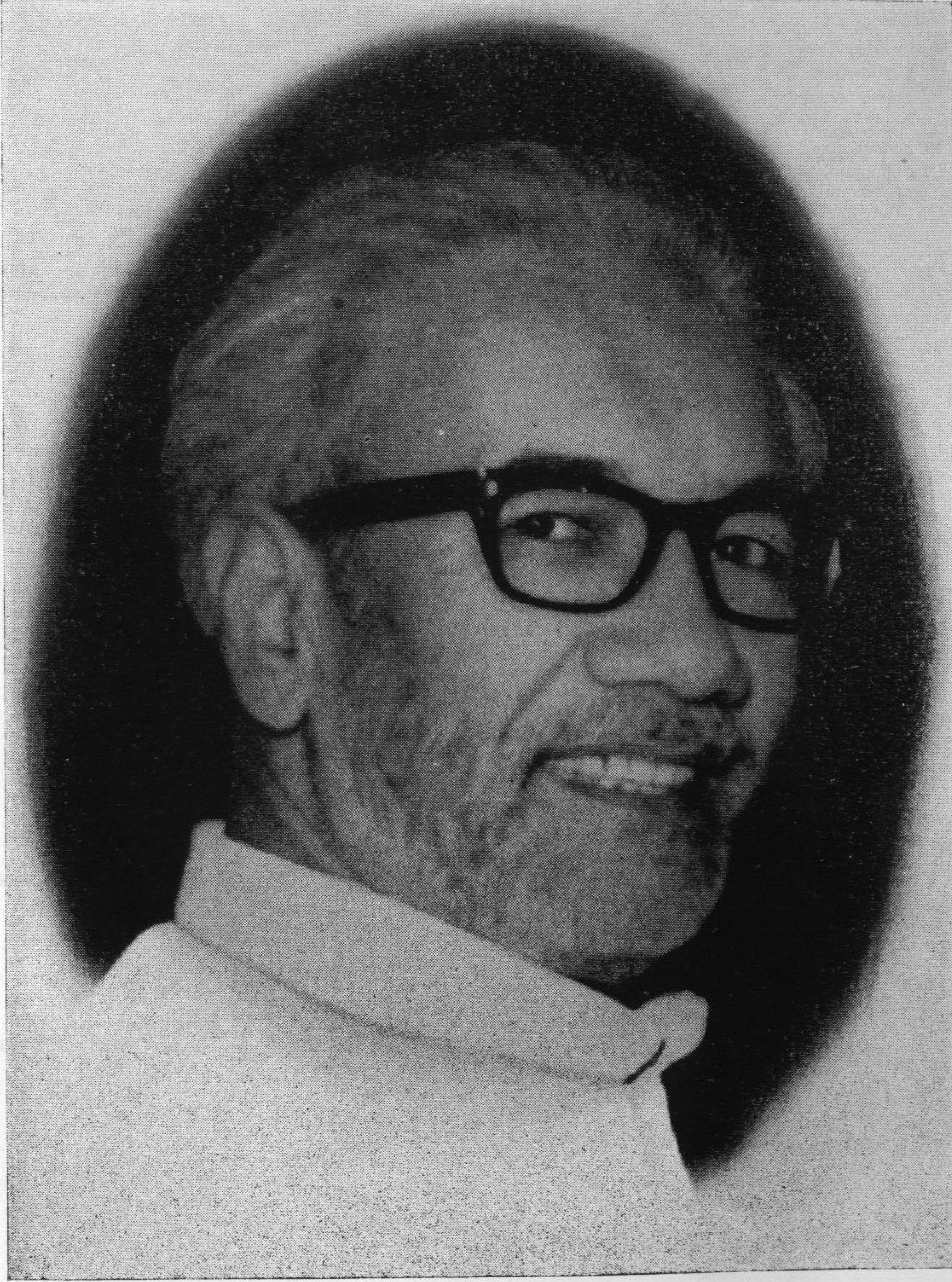
ماورائے عالمِ ایجاد اگر آئے نظر
ذرے ذرے میں تپاں ہے تابشِ شمس و قمر
انجلائے غیب سے معمور ہیں سب دشت و در
صبحِ صادق کا سماں رہتا ہے نورِ عرش پر
گلشنِ خلدِ بریں میں آفتاب آتا نہیں

تخمیس سلام محمدؐ امیر احمد محبوبؔ مدظلہ العالی

(از سید محمد امیر امام حُرؔ)

بنائے معرفتِ اسلام کی تنویر کیا کہنا
نبی کے لہجۂ حق گو میں وہ تقریر کیا کہنا
وہ صبحِ حشر ساماں اور وہ تکبیر کیا کہنا
جمالِ روئے اکبر دلبرِ شبیر کیا کہنا
شبابِ مصطفےٰ کی ہو بہو تصویر کیا کہنا

نشانِ اہلِ وفا کا بہرِ حق جس وقت گڑتا ہے
قدم ہٹتے نہیں ہرگز اگر گھر بھی اُجڑتا ہے
ستم سہ کے پیاسا رہ کے ہر ساونت لڑتا ہے
علیؑ کے گھر کا یہ دستور ہے جب وقت پڑتا ہے
تو بچّے روکتے ہیں گردنوں پر تیر کیا کہنا



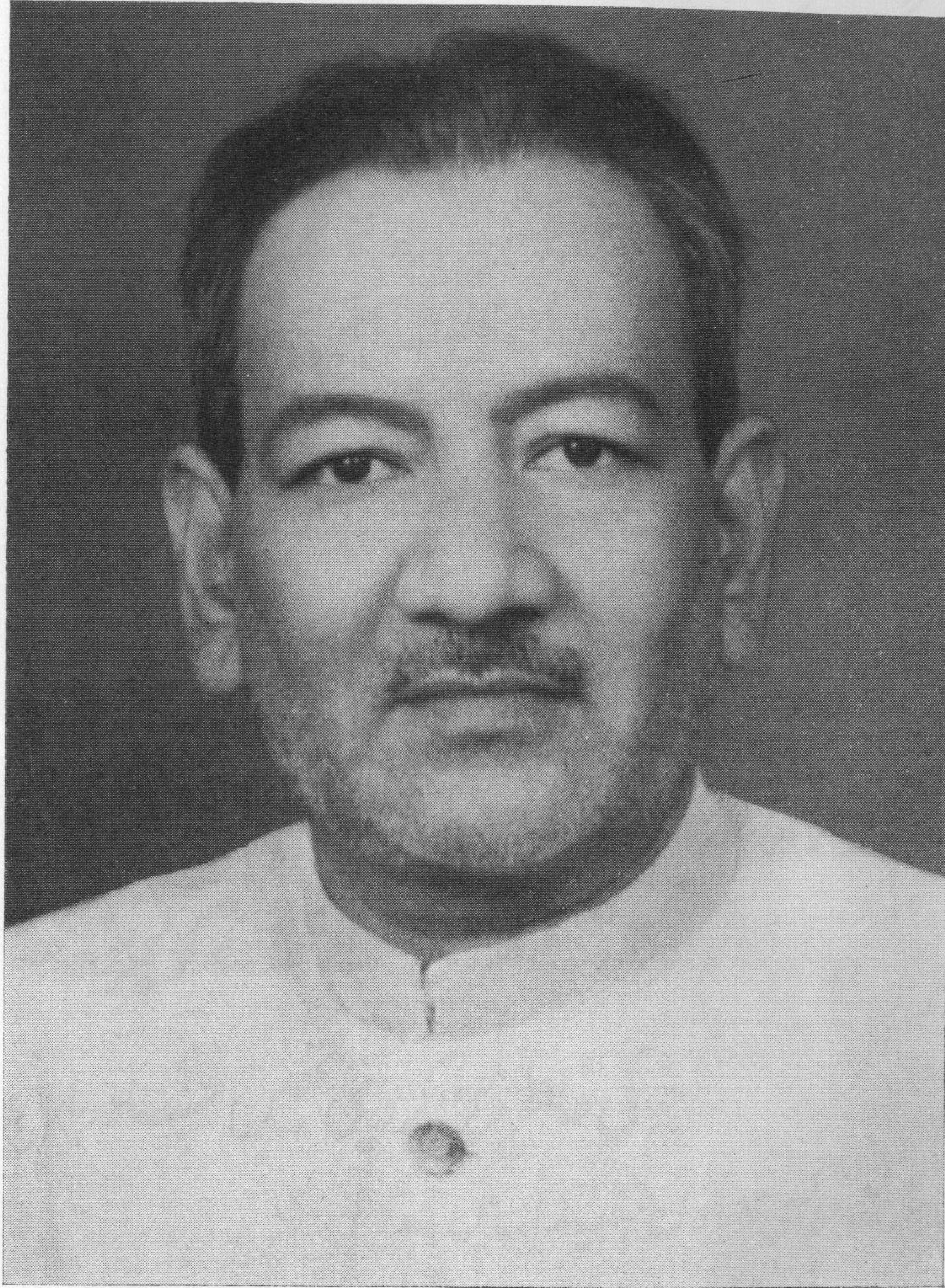
ہزاروں فتنۂ خوابیدہ بہرِ امتحاں اُٹھے
مگر در سے تری الفت کے متوالے کہاں اُٹھے

محمد امیر احمد خاں محبوبؔ راجہ محمود آباد

غضب تھی حرب پیاسوں کی کہ دریا خون کے بہتے تھے
جری تھے نرغۂ اعدا میں بھی بے خوف رہتے تھے
تپش کی تشنگی کی زخم کی ایذائیں سہتے تھے
پسر زینب کے وقتِ جنگ یہ آپس میں کہتے تھے
یہ گُل ہائے جراحت اور ہوائے تیر کیا کہنا

وہ لہجہ مصحف ناطق کا وہ معجز نما خطبہ
خطیب ایسا نہ دیکھا پھر نہ پھر ایسا سُنا خطبہ
علی کے طرز میں کس شان و شوکت سے پڑھا خطبہ
وہ دربارِ شقی اور سیدِ سجّادؑ کا خطبہ
لسان اللہ کے فرزند کی تقریر کیا کہنا

وفا کی راہ میں دیتا ہے سر ہر عاشقِ صادق
فدا کرتا ہے جاں اپنی برائے مرضیِ خالق
جہاں میں حجتِ حق ہے یہ شانِ مصحفِ ناطق
خوشی سے سر کٹانا اور نہ کرنا بیعت فاسق
یہی ہے فاطمہ کے دودھ کی تاثیر کیا کہنا



غمِ سرور سے روکو گے تو ہم دنیا ہلا دیں گے
اگر آنسو تھمے تو خون کے دریا بہا دیں گے

محمّد امیر حیدر خاں حبّ مہاراجکمار محمود آباد

تخمس سلام محمد امیر حیدر حبّ (مہاراجکمار محمود آباد)

از سیّد محمّد امیر امام حر

بخشتا ہے مرتبے کیا کیا یہ منبر بار بار
کیا شرف پاتا ہے ہر مدّاح سرور بار بار
خود بنا لیتا ہے یہ اپنا مقدر بار بار

وجد میں آتا ہے لب پر نام حیدر بار بار
دِل متاعِ دیں سے ہوتا ہے تونگر بار بار

اشکِ غم برسا رہے ہیں دیدۂ تر بار بار
ڈھل رہے ہیں چشمۂ حیواں میں گوہر بار بار
اوجِ ہستی پر چمک جاتے ہیں اختر بار بار

تازہ ہوتا ہے غمِ سبطِ پیمبر بار بار
شانِ غم بڑھتی ہی جاتی ہے برابر بار بار

تشنگی بچوں کی یاد آتی تھی اکثر بار بار
نہر پر کرتے تھے حملے بڑھ کے سرور بار بار
ٹوٹ کر جمتی تھیں پھر صف ہائے لشکر بار بار
پیاس سے جھولے میں روتا تھا جو اصغر بار بار
دیکھ کر گردوں کو رہ جاتی تھی مادر بار بار

اہلِ زر دیکھیں تو ناداری میں یہ شانِ سخا
جس سخاوت کی شہادت دے رہا ہے ہل اتیٰ
آپ ہوں فاقے سے محتاجوں پہ ہو بذل و عطا
فاطمہؑ کے گھر میں جب کھانے کو کچھ ہوتا نہ تھا
جَو کی خاطر رہن کر دیتی تھیں چادر بار بار

کیا جگر تھا جو کسی کا پاؤں میداں میں جمے
کس میں جرأت تھی کہ رن میں سامنے آکر تھمے
ہو گئے موقوف اعدا کے رجز کے زمزمے
ضیغمِ حق تھے رجز خواں تھے غضب کے ہمہمے
تھرتھرا جاتا تھا ڈر سے بابِ خیبر بار بار

حق نے دی تھی جنگ میں اس شعلہ خو کو برتری
موت کے سائے سے تھی فوجِ ستم میں ابتری
تیغ سے پیاسے کی خشکی میں ہوئی پیدا تری
پیرتی تھی خوں میں یوں شمشیرِ عباسؑ جری
ڈوب کر جیسے اُبھرتا ہے شناور بار بار

منحصر ہے اس کے غم میں بزمِ برہم کی فلاح
تھی عمل میں جس کے مضمر نسلِ آدم کی فلاح
ہے اسی میں اہلِ غم کی اہلِ ماتم کی فلاح
پیرویِ میں اس کی بیشک ہے دو عالم کی فلاح
جس نے ماری دولتِ دنیا پہ ٹھوکر بار بار

کیفِ غم دے اور مئے حُبّ تولا مجھکو دے
غیر سے کب مانگتا ہوں تو ہے مولا مجھکو دے
اپنے در سے بے طلب اے شاہِ والا مجھکو دے
ساقیا یہ غیر کا حصہ نہیں لا مجھ کو دے
میری جانب دیکھتی ہے چشمِ ساغر بار بار

سب پہ ظاہر تھا نبی کی آل کا جاہ و جلال
مستحقِ چادرِ تطہیر تھی احمد کی آل
کیا بیاں ہو انتہائے صدمہ و رنج و ملال
بے ردا تھیں پھر بھی تھا زینب کو پردے کا خیال
ہاتھ بڑھتا تھا سوئے دامانِ چادر بار بار

تھی زمیں ایک صحنِ ماتم خون رُوتا تھا فلک
محوِ حیرت تھا زمانہ غم تھا سب میں مشترک
عرش سے تا فرشِ خاکی آتے جاتے تھے ملک
صبحِ عاشورا سے لے کر عصر کے ہنگام تک
خیمۂ شہ میں بپا ہوتا تھا محشر بار بار

ہر شجر گلشن بداماں ہے محبت کے باغ کا
ہر شجر صد رنگ ساماں ہے محبت کے باغ کا
ہر شجر اے حسنؔ گل افشاں ہے محبت کے باغ کا
کلکِ حب سروِ خراماں ہے محبت کے باغ کا
اس شجر کو کر عطا اے ابرِ گوہر بار بار

"خِــرَد"

اقتباس

از

مسدس فکر و عمل

تصنیف

سیّد محمّد امیرؔ امامِ حرؔ

بڑھی خرد کی تجلّی سے فکرِ انسانی
اسی کے نور کی ہے علم میں درخشانی
اسی کے رو نے ترقی کی راہ پہچانی
اسی کی ضو میں سموئی ہے برقِ عرفانی
اسی کے سوز سے نبضِ عمل دھڑکتی ہے
اسی سے آتشِ فکر و نظر بھڑکتی ہے

خود اس کے علم سے برتر تھی اس کی ہر جدّت
ہے اپنی قدرت و جودت پر آپ اسے حیرت
نہ ہے ضیا میں یہ سرعت نہ برق میں یہ صفت
جہاں کی وسعتِ بے حد میں یہ نہیں وسعت
در آئے نقطۂ موہوم میں دقیق ایسی
فرو ہو دھر کی گہرائی میں عمیق ایسی

یہ حسن و ضو مہِ تاباں کے خال و خد میں نہیں
یہ زور و شور سمندر کے جزر و مد میں نہیں
ورائے کاہکشاں کچھ نہیں جو زد میں نہیں
کوئی جہان نہیں جو خرد کی حد میں نہیں
حقیقتوں کی شعاعوں سے ضو فشاں ہے یہ
رموزِ فطرتِ عالم کی رازداں ہے یہ

خلوص و خدمت و ہمدردی دل بقراط
کمال و جرأت افکار و جودت سقراط
خرد کی راہ شناسی ہے عقل و جاں کا نشاط
ہے راہ فکر و عمل آپ مستقیم صراط

اسی کا حکمتِ بقراط میں ظہور ہوا
اسی کا دانش سقراط میں وفور ہوا

اسی کے شک سے کھلے ہیں یقین علم کے باب
اسی سے وہم و ضلالت کے چھوٹتے ہیں حجاب
اسی سے فکر ارسطو میں تھا غضب کا شباب
منور اس سے ہوئی بو علی کے دل کی کتاب

اسی کی وجہ سے ہے ذوق جستجو باقی
اسی سے علم و عمل کی ہے آبرو باقی

اسی نے جور و تشدد کے دل کیے تھوڑے
اسی نے رسم پرستی کے راستے چھوڑے
اسی نے دہر میں تاریخ کے ہیں رُخ موڑے
اسی نے بت بھی تراشے اسی نے بت توڑے

بشر کو درس دیا فن آذری اس نے
بتوں کو توڑ کے کی ہے پیمبری اس نے

جہاں میں جلوہ سرِ کوہِ طور اس نے کیا
دِل مسیح میں حق کا وفور اس نے کیا
فضا میں فکرِ محمدؐ سے نور اس نے کیا
علیؑ کے نور جبیں سے ظہور اس نے کیا

رہ عمل جو نشان قدم سے روشن تھی
یہی حسینؑ کی سیرت سے جلوہ افگن تھی

اسی نے فطرت گوتم میں ضوفشانی کی
اسی نے دورِ اشوکا میں حکمرانی کی
اسی نے لہجۂ تلسی میں خوش بیانی کی
خرد میں ہیں صفتیں نورِ آسمانی کی

اسی سے عہد میں اکبر کے اتحاد ہوا
اسی سے کینہ و نفرت کا انسداد ہوا

اسی سے چاند سی بی بی بنی مہرِ تاباں
اسی کی ضو نے بڑھایا تھا حُسن نور جہاں
اسی کے جلووں سے ہے حسن حور نور فشاں
جمال زن ہے اسی سے جمالِ کون و مکاں

طلوع اسی سے ہوا مہر عشق کامل کا
خطِ نظر میں لگا دوڑنے لہو دل کا

اسی سے حُسن نے نرمی بڑھائی ہے دل کی
اسی سے حُسن نے عاشق کے دل میں منزل کی
اسی سے قلب نے تالیفِ قلب حاصل کی
اسی سے دل نے ضیا پائی عشق کامل کی

"خوشا وہ دل کہ ہے جس دل میں آرزو اس کی
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو اس کی"

اسی سے شعر و ادب نے فروغ ہے پایا
اسی کی روشنی تہذیب کا ہے سرمایہ
تمدنوں پہ رہا اس کے فضل کا سایہ
اسی کا زمزمہ ہر بار رنگ نو لایا

اسی کا نور درخشاں ہے فکر غائر میں
اسی کا رنگ نکھرتا ہے ذہن شاعر میں

اسی سے خسروِ شیریں زباں تھا سحر بیاں
سلگ رہا تھا دلِ عشق میں غمِ جاناں
تھا سازِ عقل کے پردے میں سوزِ عشق نہاں
نہاں تھا دردِ محبت میں درد کا درماں

"فسانۂ غمِ دل باصد اشتیاق بگفت
بجاں کاستہ افسانۂ فراق بگفت"

یہی کبیر کے لب پر بنی وہ حرفِ مبیں
لیے ہے سادگی جس کی معانیِ رنگیں
دقیق مسئلے ہوتے ہیں پل میں ذہن نشیں
خرد کا دین ہے انسانیت، چہ کفر و چہ دیں

جو من کی بات نہ سمجھا وہ من کو کھو کے گیا
اس ایک ٹوکری مٹی کا ڈھیر ڈھو کے گیا

اسی سے فکر تھی فیضی کی تند رو، سر تیز
خرد کی ضو سے فضا بن گئی تھی فکر انگیز
ہر ایک شعر ہے اس کا، بشانِ ولولہ خیز
نکاتِ نطق و معانی سے سر بسر لبریز

"مپرس راہ" کہ چوں ہر کجا دل افتاد است
"نشاں نہاست کہ منزل بمنزل افتاد است"

اسی سے تھا دلِ عرفی، بفرطِ سوز و گداز
بشانِ حریت و عزم فقر کا دم ساز
تھی یوں مناعتِ طبعِ غیور نغمہ طراز
ہوئی بلند رگِ جاں سے عشق کی آواز

"دلش ز دردِ گراں مایہ چوں جگر" ز شرار
"دماغش از گلہ خالی چو خاطرش ز غبار"

اسی سے قلب نظیری تھا آستانۂ عشق
فروغ داغِ جگر تھا چراغ خانۂ عشق
اسی کی ضو میں سناتا تھا وہ فسانۂ عشق
سُنو ذرا دلِ پر درد سے ترانۂ عشق

"گریزد از صف ما ھر کہ مرد غوغا نیست
کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست"

اسی سے تھا دلِ بیدل وہ منزلِ عرفاں
تپاں تھا جس کی حرارت سے جادۂ رگِ جاں
ضیائے دیں سے فروزاں تھی مشعلِ ایقاں
دبا تھا جذبۂ ایماں سے شور آہ و فغاں

"بہ محفلی کہ دل آئینۂ رضا طلبی است
نفس درازی فریاد پائے بی ادبی است"

اسی سے میر نے وہ شان سوز حاصل کی
اندھیری رات میں جو روشنی تھی محفل کی
یہ دے رہی ہے خبر ہم کو کن منازل کی
ذرا سُنو تو صدا اس دکھے ہوئے دل کی

"گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں" اسکی
"نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں" اسکی

اسی سے غالب خوش فہم و نکتہ داں کا مزاج
کمالِ فکر میں پہنچا بنقطۂ معراج
فضائے شعر ہے یوں زیر بارِ منت آج
ہیں موج خیز خرد اس کے ذہن کی امواج

"غبار طرف مزارش پیچ و تابی ہست
ہنوز در رگ اندیشہ اضطرابی ہست"

اتر کے غم جو رگِ سنگ میں شرار ہوا
لہو کی نہر بہی، حشر آشکار ہوا
تپش سے دل کو نہ دم بھر کبھی قرار ہوا
جو دردِ عشق گیا دردِ روزگار ہوا

”گلہ تھا شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا“

جہان سوز بنا سازِ دلربائے غزل
بھری گدازِ غمِ عشق سے نوائے غزل
کہاں سے شرحِ غمِ روزگار لائے غزل
”بقدرِ ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل“

فضائے شعر تھی محدود نکتہ داں کے لیے
”کچھ اور ”وسعتیں“ درکار تھیں ”بیاں“ کے لیے“

اسی سے فکرِ رسائے دبیر تھی عالی
سخن نے جس کے نئے طرز کی بنا ڈالی
ادب میں منزلتِ نکتہ آفریں پالی
سُنا رہا ہے جو انجامِ نیک اعمالی

”وہ گل جو خاک ہوا خاک سے غبار ہوا
خزاں کے بعد وہی غیرتِ بہار ہوا“

اسی کے نور سے فکرِ انیس تھی روشن
فضائے شعر میں ہے جس کی برق جلوہ فگن
سپہرِ نظم بنی بات میں زمینِ سخن
ہوا طلوع جہانِ ادب میں نیرِ فن

”نئے سیاق سے بگڑے ہوئے حساب بنے
پڑا جو عکس تو ذرے بھی آفتاب بنے“

سخن نے جس کے سنایا وہ درس اسلامی
کہ جس نے کاٹ دیا رنگ کوفی و شامی
خیال پختہ سے بدلی خیال کی خامی
بدل کے رہ گئے معیارِ فتح و ناکامی

"محل رنج و مصیبت یہ دار فانی ہے
رضائے حق ہو تو مرنا بھی زندگانی ہے"

اسی سے شاد کا دل تھا وہ نور کا پرتو
عیاں ہے جس کی محبت کی لو میں عقل کی ضو
تھی اس کی نبض تحیّر میں موجِ فکر کی رو
سکوتِ محض میں سن لو خیال کی تگ و دو

"جہاں ہے مکتبِ حیرت سبق ہے چپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا"

بکاوشِ سحری و بفکر نیم شبی
بنی یہ سینۂ اقبال میں وہ لے ادبی
خروش و شور جہاں میں صدائے دل نہ دبی
عجم کا ساز تھا لیکن نوا رہی عربی

"غزل سرود و نواہائے رفتہ باز آورد
بایں فسردہ دلاں حرف دلنواز آورد"

کہیں ہے جذبۂ عشق اور کہیں ہے فکر و نظر
کہیں ہے آتش گل اور کہیں گل اخگر
پیام مشرق و آہنگ مغربی کا اثر
دکھا رہے ہیں یہ اضداد زندگی مل کر

"حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں"

اسی سے جوش نے پائی وہ طبع بے پروا
کہ جس کی گرم روی نے کیا ہے حشر بپا
فروغ فکر سے روشن ہے راستہ جس کا
لہک رہے ہیں چمن اور مہک رہی ہے فضا

"فلک کی خو ہے تو ہو بجلیاں گرانے کی
کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مُسکرانے کی"

تضادِ شعلہ و شبنم نزاعِ سیف و سبو
جنون و حکمت و فکر و نشاط کے پہلو
ہر ایک رنگ میں روشن ہے شعرِ فلسفہ خو
ہے عرش و فرش کی رونق اس آگ کا جادو

"بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی
ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی"

جہانِ شعر میں ہے وسعتِ جہاں اے حر
سُنا رہا ہے یہ عالم کی داستاں اے حر
ادب کے جسم میں ہے شعر مثلِ جاں اے حر
کلام ہے زمکاں تا بلا مکاں اے حر

علوم و فکر و عمل تار و پود منطق ہیں
جمال و عشق اساس وجود منطق ہیں

طابع : روٹا پرنٹ ایجنسی
بلاسس اسٹریٹ
کراچی